یکم جولائی ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۱۳

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

غزہ اور عرب رائے عام

Michael Robbins & Amaney A. Jamal

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ عرب دنیا کی رائے عامہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے تعلقات کو معمول پر لانے کی تمام کوششوں پر شدید منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔

اسرائیل نے ۲۰۲۰ء میں امریکا کی وساطت سے ابراہم معاہدے کے تحت اپنے تمام پڑوسیوں سے تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کی۔ ایسے میں بہت سے تجزیہ کاروں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ عرب دنیا کے لیے فلسطین کا کاز اب بھی کچھ اہمیت رکھتا ہے یا نہیں۔ عرب دنیا میں اِس حوالے سے خاموشی کے بارے میں شکوک و شبہات ۲۰۲۳ء کے اواخر میں شروع ہوئے۔ جب سعودی عرب نے اس اہم معاہدے یعنی میثاقِ براہیمی سے وابستہ ہونے کا واضح اشارا دیا۔ وہ اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانا چاہتا تھا اور جواب میں کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔ تب تک سعودی حکومت اِس موقف کی حامل رہی تھی کہ اسرائیل سے تعلقات اُسی وقت معمول پر لائے جاسکتے ہیں جب وہ ایک آزاد و خود مختار فلسطینی ریاست کے قیام پر متفق ہو جائے۔

جب حماس نے ۷؍اکتوبر ۲۰۲۳ء کو اسرائیلی سرزمین پر حملے کیے تو اسرائیل نے حماس کو کچلنے کے نام پر انتہائی سفاک فوجی آپریشن شروع کیا۔ اِس آپریشن میں طاقت بہت وسیع پیمانے پر استعمال کی گئی اور عام فلسطینی شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سلسلہ شروع کیا گیا تو دنیا بھر میں اسرائیلی فوجی اقدامات کی شدید مذمت کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

اسرائیل نے غزہ کی ناکہ بندی ایک زمانے سے کر رکھی ہے جس کے نتیجے میں وہاں کے باشندوں کے لیے بنیادی چیزوں کی کمی بھی شدید بحران کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ پانی اور خوراک کے علاوہ دواؤں اور علاج کی سہولتوں کا فقدان بھی عام فلسطینیوں پر بہت بُری طرح اثر انداز ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔

غزہ اور مغربی کنارے کے فلسطینیوں اور اسرائیلیوں نے بہت طویل مدت تک تشدّد اور محرومی کا سامنا کیا ہے تاہم فلسطینی علاقوں پر اسرائیلی قبضے کی عرب دنیا میں مخالفت کبھی فیصلہ کن ثابت نہیں ہوئی۔ اِس بار لڑائی نے جتنے بڑے پیمانے پر تباہی اور ہلاکتوں کی راہ ہموار کی، اُسے دیکھتے ہوئے بہت سے تجزی کاروں نے یہ اندازہ لگایا کہ اِس بار عرب دنیا کے شہریوں میں اسرائیل کے خلاف جذبات خطرناک اور فیصلہ کن حد تک بھڑک اٹھیں گے اور اِس کے نتیجے میں اُن کی حکومتوں کی پالیسیاں بھی بدلیں گی اور لب و لہجہ بھی۔

چند تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ جو کچھ غزہ میں ہوا ہے، اُس کے نتیجے میں فلسطینی کاز مضبوط ہونے کے بجائے کمزور ہوا ہے اور ایک بڑی، مایوس کن تبدیلی یہ واقع ہوئی ہے کہ فلسطینی کاز اب بین الاقوامی ایجنڈے سے ہٹ سا گیا ہے۔ ایک واضح تبدیلی یہ ہے کہ جن عرب ممالک نے اسرائیل سے امن معاہدے پر دستخط کیے تھے، اُن میں سے کسی نے بھی معاہدے سے الگ ہونے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ اسرائیل سے سفارتی تعلقات رکھنے والے کسی بھی عرب ملک نے تعلقات ختم نہیں کیے۔ امریکا کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے حال ہی میں قطر، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کا دورہ کیا۔ اِس دورے کے دوران فلسطین کا مسئلہ بالائے طاق رہا۔ فریقین نے صرف معاشی مفادات کی بات کی۔ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، فلسطینیوں پر کیا گزر رہی ہے، اِس سے کسی کو بظاہر کچھ بھی غرض نہیں۔ چند ایک تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ نہتے فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل نے جو جنگ جاری رکھی ہے، اُس کے بارے میں عرب دنیا کا مجموعی عوامی ردِعمل خانہ پُری کی سطح سے بھی بہت کم ہے۔

ایک بات پھر بھی ہے جسے بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے خطّے میں رائے عامہ کے جن جائزوں کا اہتمام کیا ہے، اُن سے معلوم ہوا ہے کہ رائے عامہ میں چند ایک ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جنہوں نے متعلقہ حکومتوں کی طرزِ فکر و عمل پر تھوڑا بہت اثر ضرور مرتب کیا ہے۔ غزہ کی صورتحال نے عرب ریاستوں کے بنیادی مفادات کو تو خیر تبدیل نہیں کیا ہے تاہم شہریوں میں بڑھتے ہوئے غصے نے خارجہ پالیسی پر ضرور اثرات مرتب کیے ہیں۔ جب اسرائیل نے فلسطینیوں پر بم برسانے شروع کیے، تب اسرائیل اور عرب دنیا کے درمیان تعلقات معمول پر لانے کی تمام

اندرونی صفحات پر

- ایران پر حملہ: وہی جُھوٹ، وہی بڑھک
- غزہ: امدادی مراکز میں موت بانٹتی اسرائیلی فوج
- یورپ: ٹینک تو اچھے ہیں لیکن چلائے گا کون؟
- اسلامی بم کیوں نہیں؟
- بھارتی بحریہ نشانے پر
- اسرائیل کا جوہری پروگرام: پردہ اٹھانے کی ضرورت
- چیٹ بوٹس ذہن کو ختم کر رہے ہیں!

کوششیں روک دی گئیں۔ ٹرمپ نے حال ہی میں سعودی عرب کا جو دورہ کیا ہے، اُس کے دوران میثاقِ براہیم کے تحت اسرائیل اور عرب دنیا کے تعلقات معمول پر لانے کا معاملہ ایجنڈے پر نہیں تھا۔ غزہ کی صورتحال کے باوجود چند عرب حکومتوں کا خیال تھا کہ اسرائیل سے بہتر تعلقات اسٹریٹجک حوالے سے استحکام یقینی بنانے کے لیے ناگزیر ہیں۔ عوام کی طرف سے مخالفت کے باعث حکومتیں اِس معاملے میں زیادہ آگے بڑھنے سے گریزاں ہیں۔ اسرائیل اور امریکا نے عرب دنیا کے حوالے سے جو سوچ رکھا تھا، وہ نہیں ہو پا رہا۔

عرب دنیا کے حکمران ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء سے قبل فلسطینی کاز کے لیے اپنے باشندوں کی حمایت کو نظرانداز کرتے رہے تھے مگر اب وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں کیونکہ فلسطینیوں سے ہمدردی اور یکجہتی کے جذبات غیر معمولی ہیں۔ عرب دنیا کے حکمران اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر اسرائیل خود کو عرب دنیا سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ فلسطینی ریاست کے قیام کی طرف قدم بڑھایا جائے

عوام کی ترجیحات

مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقا کے عام شہریوں نے طویل مدت سے فلسطینی کاز کی حمایت جاری رکھی ہے۔ اب جبکہ غزہ کے مسلمانوں پر اسرائیلی مظالم کا سلسلہ جاری ہے، فلسطینی کاز کے لیے حمایت کئی گنا ہو چکی ہے۔ ہماری تنظیم عرب بیرومیٹر نے اِس دوران متعدد ممالک میں رائے عامہ کا جائزہ لیا ہے تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ فلسطینی کاز کے لیے حمایت کس منزل میں ہیں اور اس حوالے سے عرب اور افریقی حکمرانوں کی سوچ کیا ہے۔ مراکش سے قطر تک رائے دہندگان نے فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے اسرائیلی مظالم کو صریح قتلِ عام اور نسلی تطہیر سے تعبیر کیا ہے۔ ہاں، بہت سوں نے اسرائیل کے حقِ وجود کو بھی تسلیم کیا ہے تاہم وہ چاہتے ہیں کہ فلسطینی ریاست کے قیام کی راہ بھی ہموار کی جائے۔ اُن کے خیال میں حقیقی اور دیرپا امن یقینی بنانے کے لیے ناگزیر ہے کہ دو ریاستوں کا نظریہ قبول کیا جائے اور اُس پر عمل بھی کیا جائے۔ خیر، اسرائیل سے مخاصمت اور نفرت برقرار ہے۔ تیونس میں صرف تین فیصد رائے دہندگان نے اسرائیل کے حق میں بات کی۔ اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے سے متعلق کی جانے والی کوششوں کی حمایت میں بھی بہت نمایاں حد تک کمی آئی ہے۔

جن ملکوں نے میثاقِ براہیمی پر دستخط کیے ہیں، اُن میں بھی اسرائیل کے لیے حمایت پریشان کن حد تک گری ہے۔ لوگ اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کی کوششوں کو درست نہیں سمجھتے اور اِس حوالے سے اپنے تحفظات بیان کرنے میں ہچکچاہٹ یا بخل کا مظاہرہ بھی نہیں کر رہے۔ مراکش میں یہ ہوا ہے۔ مراکش کی حکومت نے ۲۰۲۰ء میں میثاقِ براہیمی پر دستخط کیے تھے۔ وہاں اب صرف ۱۳/فیصد افراد چاہتے ہیں کہ اسرائیل سے تعلقات معمول پر لائے جائیں۔ ۲۰۲۲ء میں اسرائیل اور عرب دنیا کے درمیان تعلقات معمول پر لانے کے حوالے سے حمایت ۳۱ فیصد یا اس سے زیادہ تھی۔

جو کچھ اسرائیل نے غزہ کے لوگوں کے ساتھ کیا ہے، اُس کے بعد سے امریکا اور دیگر انٹرنیشنل پلیئرز کے لیے بھی حمایت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اسرائیل نے جس بے دردی سے اور بین الاقوامی قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے فلسطینیوں کو شہید کیا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے عرب دنیا کے عوام کی اکثریت تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کی حمایت کے حق میں نہیں۔ اردن، لبنان، ماریطانیہ، عراق اور دیگر مسلم ممالک میں عرب اسرائیل تعلقات معمول پر لانے کی کوششوں کے لیے حمایت میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے۔ رائے دہندگان کا کہنا ہے کہ فی الحال ایسی کوششیں ترک کر دینی چاہئیں۔ فرانس اور برطانیہ کے حوالے سے بھی عرب دنیا کے متعدد ممالک میں ایسے ہی جذبات پائے جاتے ہیں۔ لبنان، ماریطانیہ، اردن، عراق اور دیگر عرب و افریقی ممالک میں فرانس اور برطانیہ کے حوالے سے خوش دِلی کے جذبات میں کمی واقع ہوئی ہے۔ لوگ اِن دونوں طاقتوں سے ناراض ہیں کیونکہ اِنہوں نے اسرائیل کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا۔ ان تمام ملکوں میں چین کے لیے قبولیت تیزی سے بڑھی ہے۔ چین کو مجموعی طور پر مغرب نواز یا مسلم دشمن ملک کے طور پر نہیں دیکھا جاتا۔ بیشتر عرب ممالک کے عوام چین کے حوالے سے موافق جذبات رکھتے ہیں اور اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے حق میں ہیں۔

پندرہ سال قبل جب عرب دنیا میں بیداری کی لہر دوڑی تھی، تب بھی رائے عامہ تبدیل ہوئی تھی مگر خیر معاملات بہت مختلف تھے۔ اب رائے عامہ میں رونما ہونے والی تبدیلی بہت نمایاں ہے۔ ڈیڑھ سال سے عرب دنیا میں اسرائیل اور امریکا کے خلاف مظاہرے عام ہیں۔ ۲۰۲۳ء اور ۲۰۲۴ء کے دوران عرب بیرومیٹر نے جو سروے کرائے ہیں، اُن میں حصہ لینے والوں میں سے اوسطاً ۱۰/فیصد نے بتایا کہ وہ کسی نہ کسی مرحلے پر مظاہروں میں، احتجاج میں شریک رہے ہیں۔ امریکا میں جب ریاستی نظم کے جبر کے خلاف ۲۰۲۰ء میں مظاہرے ہوئے تھے، تب اُن میں حصہ لینے والے نوجوانوں کا تناسب بھی یہی تھا۔ اس حوالے سے کیسر فیملی فاؤنڈیشن اور سِوز اینیلٹکز نے سروے کرائے تھے۔ رواں سال اپریل اور مئی میں غزہ کی صورتحال کے حوالے سے الجزائر، بحرین، مصر، عراق اردن، لبنان، لیبیا، ماریطانیہ، مراکش، عمان، شام، تیونس اور یمن میں مظاہرے ہوتے رہے ہیں۔ اپریل میں صرف ایک دن میں ۶۶ شہروں میں ۱۱۰/مظاہرے ہوئے۔

گزشتہ ماہ ثمود نامی ایک بڑا کارواں (جو تیونس، لیبیا اور دیگر ممالک کے باشندوں پر مشتمل تھا) لیبیا پہنچا۔ یہ کارواں تیونس سے چلا تھا۔ اِس امدادی قافلے کی منزل غزہ ہے۔ غزہ کی جانب بڑھنے کے مراحل میں اس قافلے کے شرکا کی تعداد میں اضافے کی توقع ہے۔ اس نوعیت کے واقعات کو انٹرنیشنل میڈیا آؤٹ لیٹس میں زیادہ کوریج نہیں ملی۔

اگر عرب دنیا میں عوام کے جذبات اور احتجاج کو کچلنے والی حکومتیں نہ ہوتیں تو غزہ کے حوالے سے صورتحال یعنی احتجاجی کیفیت بہت مختلف ہوتی۔ مظاہرے بہت زیادہ اور بہت بڑے پیمانے پر ہوتے۔ اور یہ سب کچھ عرب خطے سے باہر کے لوگوں اور تجزیہ کاروں کو بھی بخوبی دکھائی دیتا۔ عرب دنیا میں مظاہروں پر سرکاری مشینری نے پابندی عائد نہیں کی مگر لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سرکاری پالیسیوں سے اختلاف پر مبنی مظاہرے اور احتجاج میں شرکت کرنے کا اُنہیں علانیہ حق حاصل نہیں ہے۔

عرب بیرومیٹر نے ۲۰۲۱ء اور ۲۰۲۲ء کے دوران گیارہ عرب ممالک میں سروے کیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ صرف ۳۶ فیصد کے خیال میں حکومتیں پُرامن مظاہروں اور احتجاج ہونے کی آزادی ایک خاص حد تک دیتی ہیں۔ صرف تیونس ایسا ملک تھا جہاں ۶۱ فیصد رائے دہندگان نے کہا کہ اُنہیں پُرامن احتجاج میں شریک ہونے کی آزادی حاصل ہے۔ جب رائے عامہ کے یہ جائزے کیے گئے تھے، تب سے اب تک خطے میں بیشتر حکومتیں عوام کو سرکاری پالیسیوں کے خلاف سوچنے اور اختلاف کا اظہار کرنے کی آزادی دینے کے حق میں نہیں رہیں۔

اردن نے اسرائیل سے امن معاہدہ کر رکھا ہے۔ جب غزہ میں اسرائیلی فوج کی بھرپور کارروائی شروع ہوئی، تب

اُردن میں ہر جمعہ کو نماز کے بعد بڑے پیمانے پر مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب اردن کے دارالحکومت عمان میں اسرائیلی سفارت خانے کے باہر ایسے ہی مظاہرے بڑھ گئے تو اسرائیل نے سفیر کو واپس بلالیا۔ تب سے اب تک اردن میں اسرائیلی سفارت خانہ غیر فعال سا رہا ہے۔ نومبر ۲۰۲۳ء میں اردن کی حکومت نے عوام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث اسرائیل سے اپنا سفیر واپس بلالیا۔ عوام کی بڑھتی ہوئی ناراضی کے باوجود اردن نے اسرائیل سے تعلقات کسی نہ کسی سطح پر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان اشتراکِ عمل بھی رہا ہے۔ اپریل ۲۰۲۴ء میں جب ایران نے اسرائیل کو میزائل اور ڈرونز کے ذریعے نشانہ بنایا تو اردن کی حکومت نے امریکا کے ساتھ مل کر اسرائیل کے دفاع میں اہم کردار ادا کیا۔ اِس پر اردن کے عوام بپھر گئے اور مظاہروں کا سلسلہ زور پکڑ گیا۔ رواں سال اپریل میں اردن کی حکومت نے اخوان المسلمون پر پابندی عائد کردی۔ یہ تنظیم یا تحریک اسرائیل کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق میں احتجاجی مظاہروں کا اہتمام کرتی رہی ہے۔ اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن کے باعث دو ماہ سے اردن میں اسرائیل کے خلاف اور غزہ کے باسیوں کے حق میں مظاہروں کا زور بہت حد تک ٹوٹ گیا ہے۔

مراکش کی حکومت بھی اس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتی کہ ملک میں کچھ لوگ اسرائیل سے اُس کے تعلقات کو تنقید کا نشانہ بناتے رہیں۔ یہی سبب ہے کہ اسرائیل مخالف مظاہروں کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ جو لوگ اسرائیل سے امن معاہدے کو ختم کرنے کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، اُنہیں مراکشی حکومت جیل میں ڈالتی رہی ہے۔ خیر، ایسے اقدامات سے اسرائیل مخالف مظاہرے اور احتجاج ختم نہیں ہوا۔ ہاں، مظاہرین نے اپنا طریقِ کار بدل لیا ہے۔ اب شہروں کے مرکزی علاقوں کو چھوڑ کر بندرگاہ پر مظاہرے ہوتے ہیں۔ چند ماہ کے دوران مراکش میں اسرائیل مخالف لوگوں نے بندرگاہوں کا رُخ کرکے ڈاک یارڈ میں کھڑے ہوئے اُن جہازوں کو نشانہ بنایا ہے جو غزہ کے خلاف اسرائیلی فوج کی کارروائیوں میں معاونت کرتے رہے ہیں۔ رواں سال اپریل میں مراکش کی سب سے بڑی مزدور انجمن نے حکومت پر زور دیا کہ وہ اسرائیل کی جنگی کارروائیوں میں حصہ لینے اور مدد کرنے والے جہازوں کو مراکش کی بندرگاہوں پر لنگرانداز ہونے سے روکا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اِس مزدور انجمن نے فلسطینیوں کے حق میں متعدد مظاہروں میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

کویت میں اسرائیل کے خلاف بھڑکے ہوئے جذبات کو کنٹرول کرنے کے لیے حکومت نے فلسطینیوں کے حق میں کیے جانے والے مظاہروں اور احتجاج پر پابندی عائد کردی ہے۔ حکومت کے اقدامات کے خلاف کھڑے ہونے والوں کی کمی نہیں۔ کویت کے باشندوں نے غزہ کے مسلمانوں سے اظہارِ یکجہتی کے دوسرے طریقے اختیار کرلیے ہیں۔ مارچ ۲۰۲۴ء میں عرب بیرومیٹر کے ایک سروے میں ۸۴ فیصد کویتی باشندوں نے بتایا کہ وہ اسرائیل سے تعلق رکھنے والی کمپنیوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کررہے ہیں۔ ۶۲ فیصد کویتی باشندوں نے بتایا کہ اُنہوں نے غزہ کے لیے عطیات دیے ہیں۔ ۴۰ فیصد کویتی رائے دہندگان کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے سوشل میڈیا پر غزہ کے لیے چلائے جانے والے پیغامات کو پروموٹ کیا ہے۔ ۲۲ فیصد کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے غزہ کے باشندوں سے اظہارِ یکجہتی کے لیے کی جانے والی عوامی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے۔

واپسی کا کوئی سوال نہیں!

عرب حکومتوں نے غزہ کی صورتحال کے حوالے سے اسرائیل کے خلاف مذمتی بیانات ضرور داغے ہیں تاہم اُنہوں نے ایسے اقدامات سے گریز کیا ہے جن سے اسرائیل کی فوجی کارروائیوں کی راہ میں رکاوٹ کھڑی ہوتی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ عوام میں غم و غصہ نہیں پایا جاتا یا قائدین عوام کی رائے اور جذبات کو آسانی سے نظرانداز کرسکتے ہیں۔ احتجاج جاری ہے۔ عوام جانتے ہیں کہ وہ حکومتوں کو آسانی سے گرا نہیں سکتے مگر پالیسیوں پر اثرانداز تو ہوسکتے ہیں۔ عرب کی بیشتر حکومتیں واضح طور پر آمرانہ ہیں۔ جہاں بادشاہت ہے، وہاں بھی ایک خاندان ہی تمام معاملات کو ہاتھ میں لیے ہوئے ہے اور جہاں کسی جرنیل نے اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہے، وہاں بھی ایک خاص ٹولا یا گروہ ہی تمام معاملات دیکھ رہا ہے، چلا رہا ہے۔

سعودی عرب کی حکومت اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کے بہت قریب تھی کہ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو اسرائیل کی سرزمین پر حملے ہوئے اور جواب میں اسرائیلی فوج نے غزہ کے طول و عرض میں قتل و غارت شروع کردی۔ سعودی عرب کا شاہی خاندان فلسطینی ریاست کے قیام کی یقین دہانی کے بغیر ہی اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ جب غزہ کے خلاف فوجی کارروائی شروع ہوگئی اور عرب دنیا کے عوام کا مُوڈ بدل گیا تو سعودی حکومت نے بھی اسرائیلی فوجی اقدامات کی مذمت کی اور کہا کہ فلسطینی کاز کے لیے سعودی عرب کا مؤقف ذرا بھی نہیں بدلا اور ایک آزاد و خود مختار فلسطینی ریاست قائم ہونی ہی چاہیے جس کا دارالحکومت بیت المقدس ہو۔ سعودی وزارتِ خارجہ نے اپنے بیانات میں فلسطینی ریاست کے قیام کو اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کی بنیادی شرط بھی قرار دیا۔ مصر نے غزہ کی تعمیرِ نو کا منصوبہ جاری کیا جو دراصل عرب ریاستوں کی خواہشات کا عکس تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مستقبل میں غزہ کی سکیورٹی یقینی بنانے کا معاملہ بھی پیشِ نظر تھا۔ اس تجویز یا منصوبے کو عرب لیگ نے فوراً قبول کرلیا۔ یہ ڈرامائی تبدیلی تھی کیونکہ امریکا اور اسرائیل نے کہا تھا کہ غزہ کے باشندے اپنے علاقوں سے نکل جائیں تاکہ تعمیرِ نو کا مرحلہ شروع کیا جاسکے۔

اب معاملہ یہ ہے کہ اسرائیل کے لیے عرب دنیا اور افریقی اقوام میں حمایت برائے نام رہ گئی ہے۔ کل تک یہ سوچا جارہا تھا کہ سعودی عرب اور دیگر عرب ریاستوں کو میثاقِ براہیمی کے دائرے میں لایا جاسکے گا مگر اب ایسا لگتا ہے کہ معاملات بہت دور چلے گئے ہیں۔

عرب دنیا کے حکمران اسرائیل کو براہِ راست چیلنج نہیں کرنا چاہتے مگر خیر وہ اسرائیل سے قریبی تعلقات اور اشتراکِ عمل کی صورت میں پیدا ہونے والے عوام کے شدید ردِعمل کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اسرائیلی وزیرِاعظم بنیامین نیتن یاہو کو ۲۰۲۴ء میں مراکش کا دورہ کرنا تھا مگر مراکش کی حکومت نے یہ دورہ منسوخ کردیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غزہ کی صورتحال نے عرب دنیا اور افریقی ریاستوں میں رائے عامہ کو اس قدر اور اس طرح تبدیل کیا ہے کہ اب امریکی اور اسرائیلی مفادات کے لیے متنوع خطرات پیدا ہوچکے ہیں۔ جب تک عرب دنیا کے لوگ اسرائیل کے حوالے سے امریکا اور یورپی ممالک کی پالیسیوں کو دوغلے پن اور منافقت پر مبنی تصور کرتے ہیں، تب تک اسرائیل کو قبول کرنے اور اپنانے کی راہ ہموار نہیں ہوسکتی بلکہ مخالفت بڑھتی ہی جائے گی۔ اگر غزہ میں اسرائیلی فوجی اقدامات جاری رہے، بچوں اور عورتوں کی شہادت کا سلسلہ جاری رہا تو امریکا اور اسرائیل کے لیے معاملات یونہی خرابی کی نذر رہیں گے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"A hidden force in the Middle East". ("Foreign Affairs". June12, 2025)

ایران پر حملہ: وہی جُھوٹ، وہی بڑھک

Hanna Duggal

امریکی قیادت نے جو کچھ بھی ۲۰۲۵ء میں ایران کے خلاف کہا، وہی اُس نے ۲۰۰۳ء میں عراق کے خلاف کہا تھا۔ عراق کے بارے میں مغربی خفیہ اداروں نے جعلی اور فرضی رپورٹس تیار کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیار بنا رہا ہے۔ اب ایران پر ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کا الزام لگا کر کارروائی کی گئی ہے۔ جب اسرائیل اور ایران کے درمیان لڑائی نے زور پکڑا اور اسرائیل نمایاں طور پر ہدف پذیر دکھائی دینے لگا تو امریکا کو آگے آنا پڑا۔ 'الجزیرہ' نے ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ مغربی دنیا کے سیاسی و عسکری قائدین اور تجزیہ کار ایران کے بارے میں بالکل وہی لب و لہجہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو اُنہوں نے عراق کے خلاف اختیار کیا تھا۔ عراق کو مکمل تباہی سے دوچار کرنے کے لیے امریکا اور یورپ نے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تیاری کا الزام عائد کر کے عراق میں صدام حسین کی حکومت ختم کی، اُنہیں پھانسی دی اور پھر پورے عراق کو خانہ جنگی کی بھٹی میں جھونک دیا۔ عراق کے خلاف بھرپور فوجی کارروائی سے قبل جو باتیں کہی گئی تھیں، وہی باتیں اب ایران کے بارے میں کہی جارہی ہیں۔

۲۰۰۳ء میں تب کے امریکی صدر جارج واکر بش نے کہا تھا ''آج ہمارے پاس ایک خطرناک اور جارح حکومت کے پنجوں سے ایک قوم کو آزاد کرانے کی بھرپور قوت ہے۔ نئے ہتھکنڈوں اور قطعیت کے ساتھ حملے کرنے والے ہتھیاروں کی مدد سے ہم شہریوں کے خلاف تشدد کا خطرہ مول لیے بغیر اپنے تمام عسکری اہداف بہت آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔''

امریکی قیادت نے حال ہی میں ایران کی ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنانے کے بعد بھی اِس سے ملتے جلتے الفاظ ہی ادا کیے۔ جارج واکر بش نے یکم مئی ۲۰۰۳ء کو امریکی طیارہ بردار جہاز یو ایس ایس ابراہیم لنکن کے عرشے پر جو کچھ کہا تھا، کچھ کچھ ویسا ہی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایران کی ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنانے کی کارروائی کے بعد کہا۔

دو عشروں قبل جو کچھ ہوا تھا، بہت کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے۔ امریکا نے اسرائیل اور ایران کے درمیان لڑائی میں شدت آجانے پر ایران کو نشانہ بنایا اور اِس کا جواز یہ پیش کیا کہ ایرانی قیادت خطرناک راہ پر گامزن ہے۔ بڑی طاقتوں کے قائدین اب بھی امریکا کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

امریکا نے ہر دور میں کسی بھی ملک پر حملہ کرنے کے لیے جو انتباہ اور جواز استعمال کیے ہیں، وہ ملتے جلتے رہے ہیں۔ ایران کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ امریکا نے اِس بات کو یقینی بنایا ہے کہ اسرائیل کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ خطے کے کسی بھی ملک کو ایٹمی ہتھیاروں کی طرف جانے نہیں دیا جارہا۔ جب بھی کسی مسلم ملک نے ایٹمی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کو اپنانے کی کوشش کی ہے، امریکا اور اسرائیل نے آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روکا ہے اور اِس کی ایک واضح مثال کم و بیش چالیس سال قبل عراق میں ایٹمی تنصیبات کی تباہی ہے۔ پھر لیبیا کو بھی اِسی الزام کے تحت نشانہ بنایا گیا۔ عراق پر ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کا الزام تو عائد نہیں کیا گیا تاہم اُس پر وسیع پیمانے کی تباہی والے کیمیائی اور جراثیمی ہتھیار بنانے کا الزام عائد کر کے بھرپور کارروائی کی گئی اور حکومت تک ختم کر دی گئی۔ ایران بھی کہتا رہا ہے کہ اُس کا ایٹمی پروگرام خالص سویلین مقاصد کے لیے ہے یعنی ایران توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے ایٹمی توانائی کو بروئے کار لانا چاہتا ہے۔

اسرائیلی قیادت کم و بیش تین عشروں سے ایران پر ایٹمی ہتھیار بنانے کی کوشش کا الزام عائد کرتی رہی ہے۔ انتہا پسند لیڈر بنیامین نیتن یاہو نے بارہا کہا ہے کہ ایران کسی بھی وقت ایٹمی ہتھیار بنا سکتا ہے۔ اِس کا مقصد مغربی دنیا کو ایران کے خلاف کرنا رہا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں نیتن یاہو نے امریکی کانگریس پر زور دیا کہ عراق پر حملہ کیا جائے۔ جواز یہ گھڑا گیا کہ صدام حکومت وسیع پیمانے پر تباہی برپا کرنے والے ہتھیار بہت بڑے پیمانے پر تیار کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ نیتن یاہو نے یہ بھی کہا کہ ایران ایٹمی ہتھیار بھی بنانا چاہتا ہے۔ امریکا نے ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کیا مگر وہاں وسیع پیمانے کی تباہی برپا کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

اب امریکا اور اسرائیل کے حکام ایران کے خلاف الزام تراشی کی مُہم چلائے ہوئے ہیں۔ ایران کے بارے میں بہت کچھ غیر ضروری طور پر کہا جارہا ہے اور اِس میں جھوٹ کی آمیزش بہت زیادہ ہے۔ دنیا کو اندازہ ہو رہا ہے کہ امریکا اور اسرائیل مل کر ایران میں حکومت تبدیل کرانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایسی کوئی بھی تبدیلی انتہائی نوعیت کی کیفیت پیدا کرے گی۔ امریکا نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے اب تک کئی خطوں میں حکومتیں تبدیل کرائی ہیں اور اِس کے نتیجے میں انتہائی نوعیت کی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔

کیا تاریخ خود کو دُہرا رہی ہے؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عراق میں حکومت کی تبدیلی یقینی بنانے کے لیے امریکا اور اُس کے یورپی اتحادیوں نے کس نوعیت کی خرابیاں پیدا کیں۔ عراق میں حکومت ختم ہوئی تو شدید نوعیت کا انتشار پیدا ہوا۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں ہزاروں باشندے موت کے گھاٹ اُترے۔ ساڑھے چار ہزار امریکی فوجی بھی عراق میں مارے گئے۔ جو کچھ امریکا اور اُس کے اتحادیوں نے عراق میں کیا، اُس کے نتیجے میں وہاں شدید نوعیت کی فرقہ واریت پیدا ہوئی۔ اِس فرقہ واریت نے عراقی معاشرے کو منقسم کر دیا۔ یہ تقسیم ختم ہونے کے بجائے مزید گہری ہوگئی ہے۔

مسلم دنیا کے لیے پریشانی کا دور ختم نہیں ہو رہا۔ جو کچھ عراق کے خلاف کہا اور کیا گیا، وہی اب ایران کے خلاف کہا اور کیا جارہا ہے۔ امریکا اور برطانیہ نے مل کر عراق کے خلاف حملے کا جواز تیار کیا تھا اور اب امریکا اور اسرائیل نے مل کر ایران کے خلاف بھرپور عسکری کارروائی کا جواز تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

امریکی اور اسرائیلی قیادت نے جو کچھ دو ڈھائی عشرے قبل کہا تھا بالکل وہی کچھ اب بھی کہا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ جھوٹ پر مبنی ہے۔ مفروضوں کی بنیاد پر الزام لگا کر عسکری کارروائی کا جواز تیار کیا جارہا ہے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے بھی ایکس پر اپنی ایک پوسٹ میں لکھا کہ سیاسی اعتبار سے یہ کہنا بہت حد تک غلط ہوگا کہ ہم ایران میں حکومت کی تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں مگر ایران کو دوبارہ عظمت سے ہمکنار کرنے والے حکومت کا قیام یقینی بنانا بھی تو لازم ہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایرانی عوام کو اُن کی مرضی کی حکومت ملے تاکہ اُن کا ملک دوبارہ عظمت سے ہمکنار ہو۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Sounds familiar: Was this said about Iraq in 2003, or Iran in 2025?" ("Aljazeera". June 23, 2025)

غزہ: امدادی مراکز میں موت بانٹتی اسرائیلی فوج

اسرائیلی فوجیوں نے اسرائیلی اخبار 'ہارٹز' کو بتایا ہے کہ غزہ میں گزشتہ ایک ماہ کے دوران فوج نے جان بوجھ کر امدادی مراکز کے قریب فلسطینیوں پر فائرنگ کی۔ افسران اور سپاہیوں سے ہونے والی گفتگو میں انکشاف ہوا ہے کہ کمانڈرز نے ہجوم کو ہٹانے یا منتشر کرنے کے لیے فوجیوں کو براہ راست فائرنگ کے احکامات دیے، حالانکہ یہ واضح تھا کہ ہجوم کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ ایک سپاہی نے اس صورتحال کو غزہ میں اسرائیلی فوج کے اخلاقی ضابطوں کے خاتمے سے تعبیر کیا۔

حماس کے زیر انتظام غزہ کی وزارت صحت کے مطابق ۲۷ مئی سے اب تک امدادی مراکز اور ان علاقوں کے قریب، جہاں رہائشی اقوام متحدہ کے خوراک کے ٹرکوں کا انتظار کر رہے تھے ۵۴۹ افراد جاں بحق ہو چکے ہیں جبکہ ۴ ہزار سے زائد زخمی ہوئے ہیں۔ تاہم یہ واضح نہیں کہ ان ہلاکتوں یا زخمیوں میں سے کتنے اسرائیلی فوج کی فائرنگ کا نشانہ بنے۔

یہ انکشاف ہوا ہے کہ اسرائیلی فوج کے ملٹری ایڈووکیٹ جنرل نے فوج کے فیکٹ فائنڈنگ اسسمنٹ میکنزم کو ان مقامات پر ممکنہ جنگی جرائم کی تحقیقات کا حکم دیا ہے۔ یہ ادارہ ایسے واقعات کا جائزہ لینے پر مامور ہے جن میں بین الاقوامی جنگی قوانین کی خلاف ورزی کا شبہ ہو۔

اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد جاری کردہ ایک بیان میں اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو اور وزیر دفاع اسرائیل کاٹز نے ان الزامات کو سختی سے مسترد کیا اور ان دعوؤں کو خونی بہتان قرار دیتے ہوئے ان کی تردید کی۔

محصور پٹی میں غزہ ہیومینیٹیرین فاؤنڈیشن (جی ایچ ایف) کے امدادی مراکز کا آغاز مئی کے اواخر میں ہوا۔ اس فاؤنڈیشن کے قیام اور اس کی مالی معاونت کے حوالے سے کئی سوالات موجود ہیں، کیونکہ یہ اسرائیل کی جانب سے امریکی ایوینجیلیکلز اور نجی سکیورٹی کنٹریکٹرز کے ساتھ مل کر قائم کی گئی تھی۔ اس وقت فاؤنڈیشن کا سی ای او ایک ایوینجیلیکل مذہبی رہنما ہے جو امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتا ہے۔

جی ایچ ایف غزہ میں چار فوڈ ڈسٹری بیوشن مراکز چلا رہی ہے جن میں سے تین جنوبی غزہ میں اور ایک وسطی غزہ میں ہے۔ اسرائیلی فوج ان مراکز کو 'ریپڈ ڈسٹری بیوشن سینٹرز' کے نام سے جانتی ہے۔ یہ مراکز امریکی اور فلسطینی کارکنان چلا رہے ہیں جبکہ ان کی سکیورٹی اسرائیلی فوج کی جانب سے چند سو میٹر کے فاصلے سے فراہم کی جاتی ہے۔

ہر روز ہزاروں، بلکہ بعض اوقات دسیوں ہزار فلسطینی شہری ان مراکز پر خوراک حاصل کرنے کے لیے پہنچتے ہیں۔

اس فاؤنڈیشن کی ابتدائی دعوؤں کے برعکس امدادی تقسیم کا عمل شدید بدنظمی کا شکار ہے، جہاں لوگ خوراک کے ڈبوں پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ 'ہارٹز' کے مطابق جب سے یہ ریپڈ ڈسٹری بیوشن سینٹرز کھولے گئے ہیں، ان کے آس پاس فائرنگ کے کم از کم ۱۹ واقعات رپورٹ ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان واقعات میں گولی چلانے والوں کی شناخت ہمیشہ واضح نہیں ہوتی مگر اسرائیلی فوج کے علم کے بغیر کسی مسلح فرد کو ان امدادی زونز میں داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔

یہ امدادی مراکز عام طور پر روزانہ صرف ایک گھنٹے کے لیے کھلتے ہیں۔ ان علاقوں میں تعینات افسران اور فوجیوں کے مطابق، فوج ان افراد پر فائرنگ کرتی ہے جو مراکز کھلنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں، امدادی مرکز بند ہونے کے بعد بھی ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے فائرنگ کی جاتی ہے۔

ایک اسرائیلی فوجی نے 'ہارٹز' کو بتایا کہ ''یہ ایک قتل گاہ ہے، جس جگہ میں تعینات تھا وہاں روزانہ ایک سے پانچ کے درمیان افراد مارے جاتے تھے۔ انہیں دشمن سمجھ کر نشانہ بنایا جاتا ہے، وہاں ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی انتظام نہیں، بس فائرنگ کی جاتی ہے، وہ بھی ہر ممکن ہتھیار سے، چاہے وہ مشین گن ہو یا گرینیڈ لانچر یا مارٹر گولے۔ جیسے ہی امدادی مرکز کھلتا ہے فائرنگ بند ہو جاتی ہے اور لوگ جان لیتے ہیں کہ اب آگے بڑھ سکتے ہیں۔ وہاں ہماری زبان گولی ہے۔''

اس نے مزید کہا کہ ''ہم کبھی کبھار قریب سے ان پر دھاوا بولتے ہیں اور کبھی دور سے، فوج کو ان سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا، ایسا کبھی نہیں کہ کوئی جوابی فائرنگ ہوئی ہو۔ وہاں نہ کوئی دشمن ہے، نہ ہتھیار''۔

اسرائیلی فوج کے افسران نے 'ہارٹز' کو بتایا کہ فوج اسرائیلی عوام یا بین الاقوامی برادری کو وہ ویڈیوز دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی جو خوراک کی تقسیم کے مراکز کے آس پاس ہونے والے واقعات کو دکھاتی ہوں۔ ان کے مطابق فوج اس بات سے مطمئن ہے کہ غزہ ہیومینیٹیرین فاؤنڈیشن کی کارروائیوں نے جنگ جاری رکھنے کے لیے اسرائیل کی بین الاقوامی ساکھ کے مکمل انہدام کو روک رکھا ہے۔

ایک ریزرو فوجی جو شمالی غزہ میں حالیہ ڈیوٹی مکمل کر کے واپس آیا ہے، کہنے لگا کہ ''غزہ سے اب کسی کو دلچسپی نہیں، یہ ایک ایسا علاقہ بن گیا ہے جہاں الگ ہی اصول ہیں، وہاں انسانی جان کوئی معنی نہیں رکھتی۔''

ایک امدادی مرکز کی سکیورٹی ٹیم کا حصہ رہنے والے ایک اسرائیلی فوجی افسر نے کہا کہ ''جب آپ کے پاس شہری آبادی سے بات چیت کا واحد ذریعہ فائرنگ ہو تو یہ انتہائی خطرناک صورتحال ہوتی ہے، یہ نہ تو اخلاقی اعتبار سے درست ہے اور نہ ہی انسانی حوالے سے کہ لوگ ایک امدادی مرکز تک پہنچیں اور ان پر ٹینکوں، اسنائپرز اور مارٹر گولوں سے فائرنگ ہو''۔

اس افسر کے مطابق امدادی مراکز پر سکیورٹی کئی تہوں پر مشتمل ہے۔ ان مراکز اور ان سے منسلک کوریڈور کے اندر امریکی کارکن تعینات ہیں اور وہاں IDF کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے باہر کی سطح پر فلسطینی نگران ہوتے ہیں جن میں بعض مسلح ہوتے ہیں اور ابو شباب ملیشیا سے وابستہ ہیں۔

اسرائیلی فوج کی ذمہ داری بیرونی سکیورٹی کی ہے اور اس کے پاس ٹینک، اسنائپرز اور مارٹر گولے ہوتے ہیں جن کے استعمال کا مقصد امدادی مراکز میں موجود عملے کی حفاظت اور خوراک کی تقسیم کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔

افسر نے بتایا کہ ''رات کے وقت ہم فائرنگ کرتے ہیں تاکہ آبادی کو اشارہ دیا جا سکے کہ یہ جنگی علاقہ ہے اور وہ قریب نہ آئیں۔ ایک بار مارٹر گولوں کی فائرنگ رکی تو ہم نے دیکھا کہ لوگ آگے بڑھنے لگے ہیں، لہٰذا ہم نے دوبارہ فائرنگ شروع کر دی لیکن اس دوران ایک گولہ لوگوں کے ایک گروہ پر جا گرا۔''

اس نے بتایا کہ ہم نے ٹینکوں پر نصب مشین گنوں کا استعمال بھی کیا اور دستی بم بھی پھینکے، ایک واقعہ میں دھند کی آڑ میں آگے بڑھنے والے شہری فائرنگ کی زد میں آ گئے، یہ دانستہ نہیں تھا لیکن ایسی باتیں ہو جاتی ہیں''۔

اس نے یہ بھی کہا کہ ''ایک فوجی بریگیڈ شہری آبادی سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بھوکے لوگوں کو دور رکھنے کے لیے مارٹر گولے برسانا کسی صورت درست نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں حماس کے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن بہت سے لوگ صرف امداد لینے آتے ہیں۔ ایک ریاست کی حیثیت سے یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ امداد محفوظ طریقے سے ان تک پہنچے''۔

غزہ میں کام کرنے والے ٹھیکے دار

اسرائیلی کمانڈروں اور فوجیوں کے بیانات کے مطابق

اسرائیلی فوج کو فلسطینی آبادی والے علاقوں اور خوراک کی تقسیم کے مقامات سے محفوظ فاصلے پر رہنے کا حکم تھا تاہم زمینی حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔

ایک سینئر فوجی نے بتایا کہ ''آج کل جو بھی پرائیویٹ ٹھیکیدار غزہ میں انجینئرنگ کے ساز و سامان کے ساتھ کام کر رہا ہے، اسے ایک گھر کو مسمار کرنے پر ۵ ہزار اسرائیلی شیکل (تقریباً ۱۵۰۰ ڈالر) دیے جاتے ہیں۔ وہ لوگ اس سے خوب کمائی کر رہے ہیں، ان کے لیے ہر وہ لمحہ جب وہ کوئی گھر نہ گرا سکیں، نقصان کا وقت ہوتا ہے۔ فوجی نے کہا کہ اسرائیلی فورسز کو ان ٹھیکے داروں کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے''۔

اس نے مزید کہا کہ ''یہ ٹھیکیدار ایک طرح سے کلکٹر بنے ہوئے ہیں اور جہاں دل چاہے، وہاں گھر گرا دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنے سکیورٹی عملے کے ساتھ امدادی مراکز کے قریب یا خوراک کے ٹرکوں کے راستوں پر آ جاتے ہیں اور پھر جب وہ اپنی حفاظت کے لیے فائرنگ کرواتے ہیں تو نتیجے میں لوگ مارے جاتے ہیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں فلسطینی موجود ہو سکتے ہیں، لیکن ہم خود ان کے قریب جاتے ہیں اور پھر انہیں ہی خطرہ قرار دے دیتے ہیں۔ یعنی صرف ۵ ہزار شیکل کمانے کے لیے اور ایک گھر گرانے کے لیے ان لوگوں کو مارنا 'قابل قبول' سمجھا جاتا ہے جو صرف خوراک حاصل کرنے آتے ہیں۔

ان امدادی مراکز کے قریب فائرنگ کے متعدد واقعات میں جن افسران کا نام بار بار سامنے آیا ان میں بریگیڈیئر جنرل یہودا واچ بھی شامل ہے جو اسرائیلی فوج کی ڈویژن ۲۵۲ کا کمانڈر ہے۔ 'ہارٹز' پہلے ہی رپورٹ کر چکا ہے کہ واچ نے نتساریم کاریڈور کو ایک پُرخطر راستے میں بدل دیا تھا، اپنے فوجیوں کو خطرے میں ڈالا اور غزہ کے ایک اسپتال کو بغیر اجازت مسمار کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔

اب اسی ڈویژن کے ایک افسر نے بتایا کہ واچ نے اقوامِ متحدہ کے امدادی ٹرکوں کا انتظار کرنے والے فلسطینیوں کے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے فائرنگ کا فیصلہ کیا۔ افسر نے کہا کہ ''یہ واچ کی پالیسی ہے، اور کئی کمانڈروں اور سپاہیوں نے اسے بغیر سوال کیے قبول کر لیا''۔

واچ کی ڈویژن واحد یونٹ نہیں جو اس علاقے میں کام کر رہی ہے اور ممکن ہے کہ دیگر افسران نے بھی امداد کے خواہاں افراد پر فائرنگ کا حکم دیا ہو۔

ڈویژن ۲۵۲ کے ساتھ حال ہی میں شمالی غزہ میں تعینات ایک ریزرو فوجی نے ان اطلاعات کی تصدیق کی اور بتایا کہ عام شہریوں کو منتشر کرنے کے لیے اسرائیلی فوج جو حکمت عملی استعمال کرتی ہے اسے روک تھام کا طریقہ کار (deterrence procedure) کہا جاتا ہے۔

اس نے کہا کہ ''وہ نوجوان جو خوراک کے ٹرکوں کا انتظار کرتے ہیں، مٹی کے ٹیلوں کے پیچھے چھپ جاتے ہیں اور جیسے ہی ٹرک گزرتے ہیں یا رکتے ہیں تو وہ ان پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ ہم انہیں سیکڑوں میٹر دور سے دیکھ لیتے ہیں اور ایسی صورتحال نہیں ہوتی کہ وہ ہمارے لیے خطرہ بنیں''۔

عام شہریوں پر گولہ باری

گزشتہ ہفتوں کے دوران خوراک کی تقسیم کے مقامات کے قریب ہلاکتوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ غزہ کی وزارت صحت کے مطابق ۱۱ رجون کو ۵۷، ۱۷ رجون کو ۵۹ اور ۲۴ جون کو تقریباً ۵۰ رافراد شہید ہوئے۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر اسرائیلی فوج کی جنوبی کمان میں ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں انکشاف ہوا کہ اسرائیلی فوج نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے توپ خانے (آرٹلری) کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے۔

اس اجلاس میں شریک ایک فوجی نے 'ہارٹز' کو بتایا کہ ''وہ عام شہریوں سے پُر چوکوں اور چوراہوں پر توپ کے گولے فائر کرنے کی باتیں تو ایسے کرتے ہیں جیسے یہ کوئی معمول کی بات ہو۔ پوری گفتگو اس پر ہوتی ہے کہ توپ کا استعمال درست ہے یا غلط۔ لیکن کوئی یہ سوال نہیں اٹھاتا کہ اس ہتھیار کی ضرورت کیوں ہے؟ سب کو صرف اس بات کی فکر ہے کہ کہیں اس سے غزہ میں آپریشن جاری رکھنے کی ہماری قانونی حیثیت کو نقصان نہ پہنچے۔ اخلاقیات تو گویا کہیں ہیں ہی نہیں۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ آخر ہر روز خوراک کے منتظر درجنوں شہری کیوں مارے جا رہے ہیں؟

غزہ جنگ سے واقف ایک اور سینئر افسر نے بتایا کہ عام شہریوں کے قتل کو معمول کا حصہ سمجھنے کی روش نے امدادی مراکز کے قریب ان پر فائرنگ کے رجحان کو فروغ دیا ہے۔

انہوں نے محاذ پر ہونے والے فیصلوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ حقیقت کہ ایک عام شہری آبادی پر براہ راست توپوں، ٹینکوں، اسنائپرز یا ڈرونز سے فائرنگ کی جا رہی ہے، بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ آخر خوراک کے منتظر لوگ صرف اس لیے کیوں مارے جا رہے ہیں کہ وہ قطار سے ہٹ گئے یا کسی کمانڈر کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ ہم اس نہج پر کیسے پہنچ گئے کہ ایک نوجوان محض ایک بوری چاول کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو تیار ہے اور ہم اسی پر توپوں سے گولہ باری کر رہے ہیں؟''

فوجی ذرائع کا کہنا ہے کہ امدادی مراکز کے قریب ہونے والی کچھ ہلاکتیں اُن ملیشیاؤں کی فائرنگ سے ہوئیں جنہیں اسرائیلی فوج خود اسلحہ فراہم کرتی ہے اور جن کی حمایت کرتی ہے۔ ایک افسر کے مطابق اسرائیلی فوج اب بھی ابو شباب گروپ اور دیگر دھڑوں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ ''ایسے کئی گروہ ہیں جو حماس کے مخالف ہیں، لیکن ابو شباب اس سے کہیں آگے جا چکا ہے۔ وہ ان علاقوں پر کنٹرول رکھتے ہیں جہاں حماس داخل تک نہیں ہو سکتی اور فوج اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے''۔

اس ہفتے ایک بند کمرہ اجلاس میں فوجی ایڈووکیٹ جنرل کے دفتر کے سینئر اہلکاروں نے امدادی مراکز کے قریب روزانہ درجنوں شہریوں کی ہلاکتوں کے پیشِ نظر اسرائیلی جنرل اسٹاف کے فیکٹ فائنڈنگ اسسمنٹ میکانزم کو تحقیقات کا حکم دیا۔ یہ ادارہ ماضی میں ماوی مرمرہ فلوٹیلا واقعے کے بعد قائم کیا گیا تھا اور اس کا مقصد جنگی قوانین کی مبینہ خلاف ورزیوں کی چھان بین کرنا ہے۔

اجلاس کے دوران قانونی ماہرین نے خبردار کیا کہ شہریوں کی ہلاکتوں پر عالمی تنقید میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ تاہم فوج اور سدرن کمانڈ کے سینئر افسران نے مؤقف اختیار کیا کہ یہ واقعات انفرادی نوعیت کے ہیں اور فائرنگ صرف ان مشتبہ افراد پر کی گئی جو فوجیوں کے لیے خطرہ تھے۔

اجلاس میں شریک ایک فرد نے 'ہارٹز' کو بتایا کہ فوجی ایڈووکیٹ جنرل کے دفتر کے نمائندوں نے فوج کے اس مؤقف کو مسترد کر دیا۔ ان کے مطابق زمینی حقائق اس دعوے کی تائید نہیں کرتے۔ ایک اہلکار نے کہا ''یہ دعویٰ کہ یہ انفرادی واقعات ہیں، ان شواہد سے مطابقت نہیں رکھتا جن میں شہریوں پر فضا سے بم پھینکے گئے اور ان پر مارٹر اور توپ خانے سے گولہ باری کی گئی۔ یہ چند افراد کے مارے جانے کی بات نہیں، یہاں تو ہم روزانہ درجنوں ہلاکتوں کی بات کر رہے ہیں''۔

آئی ڈی ایف کے سینئر عہدیداروں نے شدید مایوسی کا اظہار کیا ہے کہ سدرن کمانڈ نے ان واقعات کی جامع تحقیقات نہیں کی اور غزہ میں شہریوں کی ہلاکتوں کو مسلسل نظر انداز کیا۔ فوجی ذرائع کے مطابق سدرن کمانڈ کے سربراہ میجر جنرل یانیو اسور عام طور پر صرف ابتدائی سطح کی انکوائریوں پر اکتفا کرتے ہیں اور زیادہ تر فیلڈ کمانڈرز کی زبانی رپورٹوں پر انحصار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے افسران کے خلاف بھی کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی گئی جن کے ماتحت فوجیوں نے شہریوں کو نقصان پہنچایا حالانکہ یہ عمل فوج کے احکامات اور بین الاقوامی جنگی قوانین کی واضح خلاف ورزی تھا۔

////// بقیہ: صفحہ نمبر ۱۵ \\\\\\

یورپ: ٹینک تو اچھے ہیں لیکن چلائے گا کون؟

’’ٹینک تو اچھے ہیں یورپ، لیکن انہیں چلائے گا کون؟‘‘ یہی وہ طعنے ہیں جو یورپ کے جرنیلوں کو سننے پڑ سکتے ہیں، خاص طور پر جب ۲۴ اور ۲۵ جون کو دی ہیگ میں ہونے والے نیٹو سربراہی اجلاس میں دفاعی اخراجات میں بڑے اضافے کا اعلان متوقع ہے۔

اگر یورپی حکومتیں یوکرین میں کسی نہ کسی قسم کے امن معاہدے کے بعد یا ڈونلڈ ٹرمپ کے وائٹ ہاؤس سے رخصت ہونے پر دفاعی بجٹ میں اضافے کے وعدوں سے پیچھے نہ ہٹیں تو آئندہ دہائی میں ان کے دفاعی اخراجات تقریباً دگنے ہو جائیں گے۔

دفاعی بجٹ کو جی ڈی پی کے ۲ فیصد سے بڑھا کر ۳٫۵ فیصد تک لے جانے کے اس اضافے کا بڑا حصہ ہتھیاروں اور آلات کی خریداری پر خرچ ہوگا لیکن فوج صرف ہتھیاروں سے نہیں بنتی، یہ انسانوں سے بھی بنتی ہے۔ نوجوانوں کو ایسی پیشہ ورانہ زندگی کے لیے آمادہ کرنا جو ان کی زندگی کو خطرے میں ڈالے، کبھی بھی آسان نہیں رہا۔

بعض ممالک میں تو زبردستی فوجی بھرتی (جسے عسکری اصطلاح میں ’جبری بھرتی‘ یا "conscription" کہا جاتا ہے) پر پہلے ہی غور ہو رہا ہے لیکن نوجوانوں کو جبراً وردی پہنا دینا بھی اس مسئلے کو حل نہیں کرے گا جو یورپ کی اجتماعی نفسیات میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ یورپی اپنی پُرامن طرزِ زندگی پر فخر کرتے ہیں، اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی، تو کیا واقعی کوئی لڑنے کو تیار ہوگا؟

وہ سروے جن میں لوگوں سے یہ پوچھا گیا کہ وہ بیرونی حملے کی صورت میں کیا ردعمل دیں گے، یورپی افواج کے لیے خوفناک نتائج لے کر آتے ہیں۔ گزشتہ سال گیلپ کے ایک عالمی سروے میں ۴۵ ممالک کے شہریوں سے پوچھا گیا کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو وہ ہتھیار اٹھانے کے لیے کس حد تک تیار ہوں گے۔ دنیا کے پانچ ایسے ممالک، جن میں چار یورپ میں تھے، جہاں جنگ کے لیے سب سے کم آمادگی پائی گئی، ان میں اسپین، جرمنی اور خاص طور پر اٹلی شامل ہے، جہاں صرف ۱۴ فیصد افراد نے کہا کہ وہ کسی غیر ملکی دشمن کے خلاف لڑنے کو تیار ہیں۔

چونکہ روس نے ۲۰۲۲ء میں یوکرین پر مکمل حملے کے بعد بہت سست پیش رفت کی ہے، اس لیے یوکرین کے محاذ سے کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر یا اس سے زیادہ دور واقع ان ممالک میں شاید زیادہ خطرہ محسوس نہ ہو رہا ہو۔

ان ممالک کے برعکس پولینڈ تو یوکرین اور روسی علاقے کالینن گراڈ سے جُڑا ہوا ہے لیکن یہاں بھی نصف سے کم شہریوں نے کہا کہ اگر ان کے ملک کو جنگ کا سامنا ہوا تو وہ لڑیں گے۔ ایک اور سروے، جو روسی حملے سے پہلے کیا گیا تھا، میں ۲۳ فیصد لتھوینین مردوں نے کہا کہ وہ حملے کی صورت میں ملک چھوڑ کر بھاگنے کو ترجیح دیں گے۔ جب یورپی شہریوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے دفاع کے لیے آگے بڑھیں تو اُن کی طرف سے صرف غیر دلچسپی پر مبنی خاموشی ہی سنائی دیتی ہے۔

کئی یورپی شہریوں کے نزدیک جنگ سے گریزاں قوم دراصل ایک کامیاب منصوبے کا نتیجہ ہے۔ یورپی یونین، جو اس براعظم کے مرکز میں قائم ہے، خود کو ایک ’امن منصوبہ‘ قرار دیتی ہے۔ گزشتہ سات دہائیوں کا محور یہ تھا کہ جرمنی اور فرانس ایک دوسرے کے خلاف دوبارہ کبھی ہتھیار نہ اٹھائیں۔ یورپی یونین کے اندر اور باہر معیشتوں کو آپس میں جوڑنے کا مقصد یہ تھا کہ حملے پہلے غیر عملی اور پھر مکمل طور پر ناقابلِ تصور بن جائیں۔

یورپی یونین میں جو بیوروکریٹک امن پسندی کا کلچر پروان چڑھا ہے، وہ شاید شہریوں کے دلوں میں کچھ زیادہ ہی رچ بس گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگ بھول چکے ہیں کہ یورپی کلب سے باہر موجود افراد، مثلاً ولادیمیر پوٹن، اس منصوبے کا حصہ نہیں ہیں۔ عسکری امور کو عرصے تک یونین میں ایک ضمنی مسئلہ ہی سمجھا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ صرف پچھلے سال ہی یورپی یونین نے پہلی بار ایک دفاعی کمشنر مقرر کیا ہے، وہ بھی اس وضاحت کے ساتھ کہ اس کا دائرہ کار صرف گولہ بارود اور میزائل بنانے والی کمپنیوں کی نگرانی تک محدود ہوگا نہ کہ افواج کی کمان تک۔

سوال یہ ہے کہ آخر یورپ کی عام آبادی جنگ کی صورت میں بھی ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار کیوں نظر نہیں آتی؟ ماہرین عمرانیات یورپ کو ایک ’بعد از ہیروزم‘ معاشرہ قرار دیتے ہیں، جہاں انفرادی آزادی اور خود کو مکمل کرنے کے خواب، ماضی کی نسلوں کے حب الوطنی کے جذبے پر غالب آ چکے ہیں۔

یورپ میں سیاسی تقسیم بھی اس رجحان میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ حالیہ دہائیوں میں دائیں اور بائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کی حمایت میں اضافہ ہوا ہے اور ان کے ووٹرز اپنے ملک کے لیے لڑنے کے تصور سے خاصے لاتعلق نظر آتے ہیں۔ معمر افراد عمومی طور پر ہتھیار اٹھانے کے معاملے میں کم جوش و خروش دکھاتے ہیں اور چونکہ یورپ ایک عمر رسیدہ براعظم بنتا جا رہا ہے، اس لیے یہ رجحان مزید گہرا ہو رہا ہے۔

اسپین اور پرتگال جیسے ممالک جنہیں ماضی قریب میں آمریت کا سامنا رہا ہے، جنگ سے مزید گریزاں ہیں۔ افغانستان اور عراق میں امریکی عسکری مہمات کی ناکامی، جن میں یورپی شمولیت برائے نام تھی، نے یورپی امن پسندوں کو مزید یقین دلا دیا ہے کہ ان کا عدم تشدد کا راستہ ہی درست ہے۔

اپنے پرامن رویے کے باوجود، یورپ میں فوجی مرد و خواتین کی کمی نہیں ہے۔ اگرچہ ۱۹۹۰ء کے بعد بیشتر یورپی ممالک میں فوجیوں کی تعداد آدھی سے بھی کم ہو چکی ہے، پھر بھی مجموعی طور پر یورپ کے پاس امریکا سے زیادہ فوجی ہیں اور آبادی کے تناسب سے دونوں تقریباً برابر ہیں۔

تاہم اب کچھ ممالک، جیسے پولینڈ، لازمی فوجی بھرتی (conscription) کو دوبارہ متعارف کروانے پر غور کر رہے ہیں، جبکہ چند ممالک جیسے ڈنمارک اور یونان نے اسے کبھی ختم ہی نہیں کیا تھا۔ کسی زمانے میں لازمی فوجی سروس کا خاتمہ ایک بڑی لبرل کامیابی سمجھا جاتا تھا لیکن اب نوجوانوں کو فوج میں لانا اس سوچ کو فروغ دینے کا ذریعہ سمجھا جا رہا ہے کہ قومی دفاع صرف تنخواہ دار سپاہیوں کا نہیں بلکہ ہر شہری کا فرض ہے۔

امن کی دُھند

یہ سوچ عوام میں جڑ پکڑنے میں وقت لے سکتی ہے، کیونکہ جب یورپی شہریوں سے دفاعی امور پر رائے لی جاتی ہے تو ایک عجیب تضاد سامنے آتا ہے۔ یورپی کمیشن کی جانب سے کرائے گئے سروے میں شہریوں نے روس کے یوکرین پر حملے اور دفاعی معاملات کو یورپی یونین کو درپیش سب سے بڑے خطرات میں شمار کیا۔ نصف سے زیادہ شہریوں کا خیال ہے کہ آنے والے برسوں میں یورپ کی سرزمین پر جنگ کے امکانات موجود ہیں۔

تاہم جب یہی لوگ یہ بتاتے ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی پر کن مسائل کے اثرات زیادہ ہیں، تو روس کا ذکر تقریباً غائب ہو جاتا ہے۔ ان کی ترجیحات میں مہنگائی، ٹیکس، پنشن اور ماحولیاتی تبدیلی جیسے مسائل کہیں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ یورپی باشندے خطرے کو محسوس نہیں کرتے، بلکہ وہ اسے کسی اور کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۰ \\\\\\

اسلامی بم کیوں نہیں؟

Imran Mulla

پاکستان ایک تسلیم شدہ ایٹمی قوت ہے۔ اُس کی یہ حیثیت ہی اُسے تمام مسلم ممالک میں سب سے ممتاز بناتی ہے اور ایٹمی قوت ہونا ہی اُس کے لیے سب سے بڑا ردِ جارحیت ہے۔ بھارت یا کسی بھی اور ملک کو پاکستان کے بارے میں کچھ بھی ایسا ویسا سوچنے سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یہ ایٹمی قوت ہے۔

اِس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ امریکا کی سرپرستی میں اسرائیل نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی مسلم ملک کے پاس ایٹم بم ہو۔ فخرِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان مرحوم نے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں پاکستان کو ایٹم بم بنانے کے قابل بنانے کی خاطر خاصی جرأت مندانہ مساعی پر مبنی ایک آپریشن مکمل کیا۔ اِس دوران اسرائیل نے کئی بار حملہ کرنے کی دھمکی دی اور دیگر طریقوں سے بھی ہراساں کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اُتنا ہی خطرناک گردانتے تھے جتنا خطرناک اسامہ بن لادن کو گردانا جاتا تھا۔ اسرائیلی خفیہ ادارے موساد کے سابق سربراہ سباستائی شبوٹ کو اِس بات کا افسوس رہا کہ وہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قتل نہ کرسکا۔ ۲۴ یا ۲۵ کروڑ اہلِ پاکستان کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خان حقیقی ہیرو ہیں۔ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے گاڈ فادر تھے۔ اب اُنہیں افسانوی شہرت حاصل ہے اور اُن کے لیے اہلِ پاکستان کے دلوں میں غیر معمولی احترام ہے۔

اِس حقیقت سے اب کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے بڑھ کر کوئی بھی پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لیے حقیقی معنوں میں ریڑھ کی ہڈی نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ مغرب کے خفیہ ادارے اُن کی ٹوہ لینے میں لگے رہتے تھے۔ اسرائیلی خفیہ ادارے چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا سراغ لگا کر اُنہیں شہید کردیا جائے۔

اب کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک زبردست جدید اور خفیہ بین الاقوامی نیٹ ورک کے تحت ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کو بھی ایٹمی پروگرام شروع کرنے اور جاری رکھنے میں مدد کی۔ شمالی کوریا نے اِس نیٹ ورک ہی کی بدولت عسکری معاملات میں اپنے آپ کو قابلِ رشک حد تک مضبوط بنایا۔

اسرائیل خود ایٹمی طاقت ہے اور محتاط ترین اندازوں کے مطابق بھی اُس کے پاس درجنوں ایٹمی ہتھیار ہیں مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان سمیت کوئی بھی مسلم ملک ایٹمی ہتھیاروں کا حامل ہو۔ جب پاکستان نے ایٹمی قوت کا درجہ حاصل کرلیا تب اسرائیل نے اس بات کو بھرپور ترجیح دی کہ ایران کو کسی بھی صورت ایٹمی ہتھیاروں کا حامل نہ ہونے دیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کے ایٹمی پروگرام کو ناکام بنانے کے لیے اسرائیل کی خفیہ سرگرمیاں جاری رہی ہیں۔ متعدد ایرانی ایٹمی سائنس دانوں کو اسرائیل نے قتل کرایا ہے۔ حال ہی میں بارہ روز جاری رہنے والی جنگ میں بھی اسرائیل نے ایران کے دس سے زائد بڑے ایٹمی سائنس دانوں کو شہید کیا ہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں، جب جنرل محمد ضیاء الحق پاکستان کے آرمی چیف اور صدر تھے، اسرائیل نے بھارت کی مدد سے ایک خصوصی منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنا تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے اس منصوبے کو بہت عمدگی سے ناکام بنایا۔ یہ ایٹمی پروگرام ہی تھا جس کی کامیابی نے پاکستان کو بھارت کے تمام جارحانہ عزائم سے اب تک محفوظ رکھا ہے۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام بھارت کے ایٹمی پروگرام کا جواب تھا۔ بھارت نے ۱۸ مئی ۱۹۷۴ء کو ایٹمی دھماکا کیا تھا اور اِسے اسمائلنگ بُدھا یعنی مسکراتے ہوئے گوتم بدھ کا نام دیا تھا۔ اس ایٹمی دھماکے نے پاکستان کے لیے بھی ایٹمی پروگرام کا شروع کیا جانا ناگزیر بنادیا۔ جب بھارت نے اپنے عزائم ظاہر کر ہی دیے تو پاکستان کے اُس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بھی پاکستان کو ایٹمی قوت میں تبدیل کرنے کا سوچا اور اِس حوالے سے تیاریوں کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ ہم گھاس کھائیں گے، پتے کھائیں گے، بھوکے رہیں گے مگر ایٹم بم بنا کر دم لیں گے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب مسیحی ایٹم بم ہے، یہودی ایٹم بم ہے اور اب ہندو ایٹم بم بھی سامنے آچکا ہے تو پھر اسلامی ایٹم بم کیوں نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان قیامِ پاکستان سے قبل پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں کراچی یونیورسٹی سے سائنس میں ڈگری لی اور پھر برلن میں میٹالرجیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہالینڈ اور بلجیم سے بھی حصولِ علم یقینی بنایا۔ ۱۹۷۴ء تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈیم میں ایٹمی ایندھن کے ایک نمایاں ادارے یورینکو کے سب کنٹریکٹر کے لیے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ یہ کمپنی یورپ کے ایٹمی ری ایکٹرز کے لیے افزودہ یورینیم پر مشتمل ایٹمی ایندھن فراہم کیا کرتی تھی۔

یورینکو کے پلانٹس میں دنیا کے بہترین سینٹری فیوجز کے بلیو پرنٹس تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی رسائی تھی۔ اس پلانٹ میں خام یورینیم کو افزودہ کرکے اِس قابل بنایا جاتا تھا کہ ایٹم بم کی تیاری میں استعمال ہوسکے۔

جنوری ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہالینڈ سے اچانک یہ کہتے ہوئے رخصت لی کہ مجھے پاکستان میں ایک ایسی پیشکش کی گئی ہے جسے قبول نہ کرنا میرے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ پیشکش بہت پُرکشش ہے۔ بعد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے یورینیم کو ایٹمی اسلحے کی تیاری میں استعمال کے قابل بنانے والے سینٹری فیوج کے بلیو پرنٹ چُرائے تھے۔ اُسی سال جولائی میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے راولپنڈی کے نزدیک ایک تحقیقی تجربہ گاہ قائم کی جو ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری میں استعمال ہونے والا افزودہ یورینیم تیار کرتی تھی۔

یہ سب کچھ چند برس تک خفیہ طور پر جاری رہا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ایٹم بم یا ایٹمی ہتھیار بنانے کے لیے جو آلات اور اشیا درکار تھیں، اُن کی درآمد کے لیے فرضی کمپنیاں قائم کی گئیں۔ سرکاری طور پر یہ بتایا گیا کہ ایک نئی ٹیکسٹائل مل بنانے کے منصوبے پر کام ہورہا ہے۔

اس امر کے پختہ شواہد موجود ہیں کہ پاکستان کی ملٹری اسٹیبلشمنٹ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے پروجیکٹ کی بھرپور مدد کر رہی تھی تاہم منتخب حکومتوں اور وزرائے اعظم کو (سوائے ذوالفقار علی بھٹو کے جنہوں نے ایٹمی پروگرام کی داغ بیل ڈالی تھی) اِس حوالے سے تاریکی میں رکھا گیا۔ بے نظیر بھٹو کو بھی جرنیلوں نے ایران سے ایٹمی ٹیکنالوجی کی شیئرنگ کے بارے میں ایک لفظ نہیں بتایا تھا۔ اُنہیں یہ سب کچھ ۱۹۸۹ء میں تہران میں حادثاتی طور پر معلوم ہوا تھا۔ اُس وقت کے ایرانی صدر علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے پوچھا کہ کیا خصوصی دفاعی معاملات پر دونوں ممالک کوئی جامع معاہدہ کرسکتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو نے اُن سے استفسار کیا کہ خصوصی دفاعی معاملات

سے اُن کی کیا مُراد ہے۔ تب ایرانی صدر نے کہا تھا کہ وہ ایٹمی ٹیکنالوجی کی بات کر رہے ہیں۔

جون ۱۹۷۹ء میں ''ایٹ ڈیز'' نامی جریدے نے ایک خصوصی آپریشن کا بھانڈا پھوڑا۔ اِس پر دنیا بھر میں شور مچ گیا۔ یہ خفیہ آپریشن ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قتل کرنے سے متعلق تھا۔ جب بھانڈا پُھوٹ گیا تو اسرائیل نے ڈچ حکومت سے احتجاج کیا۔ ڈچ حکومت نے تحقیقات کا حکم دیا۔ ہالینڈ کی ایک عدالت نے ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر جاسوسی کے الزام میں مقدمہ چلا کر اُنہیں مجرم قرار دیا تاہم بعد میں تکنیکی بنیادوں پر فردِ جرم پلٹ دی گئی۔ اِس کے باوجود پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر کام جاری رہا۔ ۱۹۸۶ء تک ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو یقین ہو چکا تھا کہ پاکستان جب چاہے، ایٹم بم بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان غیر معمولی حد تک نظریاتی انسان تھے۔ اُن کے دل میں اسلام اور اہلِ اسلام کی محبت قابلِ رشک نوعیت کی تھی۔ وہ پاکستان اور عالمِ اسلام، دونوں ہی کو بلندی پر دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں امریکیوں اور برطانویوں کا یہ رویہ چیلنج کرنا چاہتا ہوں کہ وہ باقی دنیا سے بہتر اور برتر ہیں۔ وہ اِس بات سے بہت چِڑتے تھے کہ سفید فام نسلیں خود کو دنیا کی نجات دہندہ اور سرپرست سمجھتی ہیں اور خود کو اِس منصب پر خدا کی طرف سے فائز کردہ سمجھتی ہیں۔

پاکستان کو اپنا ایٹمی پروگرام آگے بڑھانے اور فیصلہ کن مرحلے تک لانے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف تو تکنیکی معاملات تھے اور دوسری طرف اسرائیل کے خفیہ ادارے موساد کی سرگرمیاں تھیں جو کسی بھی طرح ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو نشانہ بنانے کے درپے تھا۔ حد یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان جن یورپی اداروں سے آلات اور مواد منگواتے تھے، اُن کے ایگزیکٹیوز کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ مغربی جرمنی کی ایک کمپنی کے ایگزیکٹو کو لیٹر بم بھیجا گیا۔ وہ تو بچ گیا مگر اُس کا کتا مارا گیا۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر کام کرنے والی سوئس کمپنی کورا انجینئرنگ کے ایک سینئر ایگزیکٹو کو بھی نشانہ بنایا گیا۔

ایڈرین لیوی، کیتھرین اسکاٹ کلارک اور ایڈرین ہینی سمیت بہت سے تاریخ دانوں نے بتایا ہے کہ اسرائیل کے خفیہ ادارے موساد نے پاکستان کا ایٹمی پروگرام روکنے اور ناکام بنانے کے لیے سر توڑ محنت کی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور اُن سے وابستہ لوگوں کو قتل کرنے کے منصوبے بھی بنائے گئے اور کوششیں بھی کی گئیں۔ ایک سوئس کمپنی کے مالک سیگفرائیڈ شرٹلر نے سوئس فیڈرل پولیس کو بتایا کہ موساد نے اُسے اور اُس کی سیلز ٹیم کے ارکان کو کئی بار کال کی اور دھمکایا۔

سیگفرائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ جرمنی میں قائم اسرائیلی سفارت خانے کے ملازم ڈیوڈ نے اُس سے رابطہ کیا اور صاف صاف کہا کہ ایٹمی ہتھیاروں سے متعلق تمام کاروباری سرگرمیاں فی الفور روک دو۔ پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے وابستہ ایک سابق افسر فیروز خان کا کہنا ہے کہ اسرائیل کو کسی بھی صورت یہ گوارا نہ تھا کہ پاکستان یا کوئی بھی مسلم ملک ایٹم بم بنائے۔ اسرائیلیوں کی یہ خواہش دراصل یورپ کی خواہش کا پَرتو تھی۔ اُس نے اسرائیل کو آگے کر رکھا تھا۔ اسرائیلی اس معاملے میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں ضلع راولپنڈی میں کہوٹہ کے مقام پر واقع ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کا سوچا اور اس معاملے میں بھارت سے بھی اشتراکِ عمل کا ڈول ڈالا۔ اُس وقت کی بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے اِس آپریشن کی منظوری بھی دے دی۔ منصوبہ یہ تھا کہ اسرائیل کے ایف۔۱۶ اور ایف۔۱۵ طیارے بھارت کی مغربی ریاست گجرات کے شہر جام نگر کی ایئربیس سے پرواز کریں گے اور کہوٹہ میں ایٹمی تنصیبات کو نشانہ بنائیں گے۔ بعد میں آنجہانی مسز اندرا گاندھی نے اِس منصوبے کو مسترد کر دیا اور یوں ایسا کوئی آپریشن نہ ہو پایا۔

۱۹۸۷ء میں اندرا گاندھی کے بیٹے آنجہانی راجیو گاندھی وزیراعظم تھے۔ تب بھارتی آرمی چیف لیفٹیننٹ جنرل کرشنا سوامی سُندر جی نے پاکستان سے جنگ کا منصوبہ بنایا تاکہ جنگ کی آڑ میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ اور ایٹمی پروگرام کو ختم کیا جاسکے۔ انہوں نے کم و بیش پانچ لاکھ فوجی پاکستانی سرحد سے ملحق علاقوں میں تعینات کر دیے۔ سیکڑوں ٹینک اور دیگر گاڑیاں بھی سرحدی علاقوں میں پہنچا دی گئیں۔ یہ غیر معمولی نوعیت کی اشتعال انگیزی تھی۔ راجیو گاندھی کو بھارتی فوج نے پوری طرح اعتماد میں نہیں لیا تھا اور پوری منصوبہ سازی سے آگاہ بھی نہیں کیا تھا۔ بعد میں جب اُنہیں جنرل سُندر جی کے منصوبے کا علم ہوا تو اُنہوں نے پاکستان سے کشیدگی ختم کرنے پر توجہ دی۔

اسرائیل اور بھارت کی شدید مخالفت کے باوجود امریکا اور چین نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مدد جاری رکھی۔ چین نے پاکستان کو افزودہ یورینیم اور ٹریٹیم تو دیا سو دیا، ماہرین کی خدمات بھی فراہم کیں۔ امریکا نے پاکستان کی مدد اس لیے کی کہ سرد جنگ کے دور میں پاکستان ایک اچھا اتحادی ثابت ہوا تھا۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام منظرِ عام پر آنے کے بعد اپریل ۱۹۷۹ء میں اُس وقت کے امریکی صدر جمی کارٹر نے پاکستان کی امداد نمایاں حد تک گھٹا دی تاہم چند ماہ بعد یہ فیصلہ اُس وقت واپس لے لیا گیا جب سابق سوویت یونین نے افغانستان پر لشکر کشی کر دی۔ امریکا کو پاکستان کی ضرورت پڑی کیونکہ سابق سوویت یونین گرم پانیوں تک رسائی چاہتا تھا۔ اگر پاکستان کو دیوار نہ بنایا جاتا تو سوویت افواج بحیرۂ عرب بہت آسانی سے پہنچ جاتیں۔

امریکا نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے آنکھیں بند رکھیں۔ اُس نے خفیہ طور پر پاکستان کو تکنیکی تربیت دی اور ماہرین کی خدمات بھی فراہم کیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ امریکا کی ترجیحات بدلیں تو پاکستان کی ضرورت بھی گھٹ گئی۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ایٹمی پروگرام جاری رکھنے کی پاداش میں پاکستان معاشی اور فوجی امداد روک دی۔ اِس پر پاکستان نے 'یقین دہانی' کرائی کہ وہ ایٹمی پروگرام پر کام روک دے گا۔ بعد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے بتایا کہ غیر معمولی افزودہ یورینیم کی تیاری خفیہ طور پر جاری رہی۔

معاملات نے فیصلہ کن انداز سے اُس وقت پلٹا کھایا جب بھارت نے گیارہ مئی ۱۹۹۸ء کو اپنے ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ گجرات کے علاقے پوکھرن میں کیا گیا۔ اِس کے جواب میں پاکستان نے ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو بلوچستان کے علاقے چاغی میں ایٹمی ہتھیار کے کامیاب تجربے کیے اور دنیا کی ساتویں تسلیم شدہ ایٹمی قوت بن گیا۔ اب امریکا نے بھارت اور پاکستان، دونوں پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں۔

اب ڈاکٹر عبدالقدیر خان قوم کے ہیرو بن گئے۔ وہ گاڑیوں کے ایک بڑے قافلے میں سفر کرنے لگے اور اُن کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے فوجی کمانڈوز تعینات کر دیے گئے۔ گلیوں، سڑکوں، اسکولوں اور کرکٹ ٹیموں کو ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے موسوم کیا گیا۔ وہ پاکستانی ایٹم بم کا بھرپور کریڈٹ لیتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ میزائل پروگرام کا کریڈٹ بھی لیتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط سے ایک دوسرا آپریشن بھی شروع کیا۔ انہوں نے ایک انٹرنیشنل نیوکلیئر نیٹ ورک قائم کیا جس کے تحت انہوں نے ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کو بھی ایٹمی ٹیکنالوجی سے بہرہ مند کرنا شروع

کیا۔ انہوں نے ایٹمی پروگرام کے لیے درکار پُرزے دگنی تعداد میں بنانے شروع کیے اور ضرورت سے ہٹ کر جتنے بھی اجزا یا پُرزے ہوتے تھے، وہ ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کو فراہم کرنے لگے۔

ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ خمینی بنیادی طور پر ایٹم بم بنانے کے خلاف تھے اور اِسے اسلامی تعلیمات کے حوالے سے ممنوع قرار دیتے تھے، تاہم ایرانی حکومت نے اُس وقت کے پاکستانی حکمران جنرل ضیاء الحق سے رابطہ کیا اور ایٹمی پروگرام کے لیے معاونت کی استدعا کی۔

۱۹۸۶ء سے ۲۰۰۱ء کے درمیان پاکستان نے ایران کو ایٹم بم کی تیاری کے لیے درکار بہت سے پُرزے اور مشینیں وغیرہ فراہم کیں۔ یہ سب کچھ استعمال شدہ تھا کیونکہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جدید ترین ٹیکنالوجی پاکستان کے لیے رکھی تھی۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں کے دوران ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے مشرقِ وسطیٰ کے کئی دورے کیے تاہم اسرائیلی خفیہ ادارہ بالکل درست اندازہ لگانے میں ناکام رہا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

موساد کے سابق سربراہ شبتو نے بعد میں انٹرویوز میں بتایا کہ اگر اُنہیں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کیا کر رہے ہیں تو اُن کے قتل کا حکم دے کر تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا جاتا۔

لیبیا کے سابق مطلق العنان آمر معمر قذافی نے امریکا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی خفیہ اور نام نہاد مشکوک ایٹمی سرگرمیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ معمر قذافی نے امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے اور برطانوی خفیہ ادارے ایم آئی سکس کو بتایا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان لیبیا میں ایٹمی تنصیبات کے قیام کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ اِن میں سے چند کو پولٹری فارم کی شکل دی گئی تھی۔

سی آئی اے نے لیبیا میں ایٹمی تنصیبات کے لیے لائی جانے والی مشینری کو نہرِ سویز میں پکڑ لیا۔ اس شپمنٹ میں تحقیقات کاروں کو اسلام آباد کے ایک ڈرائی کلینر کی طرف سے بھیجے جانے والے ایٹمی ہتھیاروں کے ڈیزائن ملے۔

جب یہ سب کچھ سامنے آیا تو امریکی شدید خوفزدہ ہوئے۔ ایک سینئر امریکی افسر نے 'نیویارک ٹائمز' سے گفتگو میں کہا کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ معاملات اِس حد تک بڑھ سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بہت خوفناک محسوس ہو رہا تھا۔ اِس افسر کا کہنا تھا کہ پہلے تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جدید ترین ایٹمی ہتھیار بنائے، پھر متعلقہ ٹیکنالوجی دوسرے ملکوں کو فراہم کی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایٹمی ٹیکنالوجی اُن حکومتوں تک پہنچ گئی تھی جو امریکا کے لیے انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ۲۰۰۴ء میں اعتراف کیا کہ انہوں نے ایٹمی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کا نیٹ ورک چلایا تھا اور اِس نیٹ ورک کے تحت انہوں نے ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ فروری ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان سرکاری ٹی وی پر نمودار ہوئے اور اعتراف کیا کہ یہ سب کچھ اُنہوں نے تنِ تنہا کیا تھا اور اِس سلسلے میں اُنہیں حکومتِ پاکستان کی طرف سے کسی بھی طرح کی حمایت، منظوری یا مدد حاصل نہ تھی۔ اس اعتراف کے فوراً بعد حکومت نے انہیں معاف کر دیا۔ اُس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے اُنہیں اپنا ہیرو قرار دیا۔ مگر خیر، امریکی دباؤ کے تحت اُنہوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اسلام آباد میں ۲۰۰۹ء تک گھر میں نظر بند رکھا۔ بعد میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا کہ اُنہوں نے پہلی بار ملک کو اُس وقت بچایا جب اُنہوں نے قوم کو ایٹمی قوت بنایا اور دوسری بار اُس وقت بچایا جب انہوں نے ایٹمی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ کا سارا الزام اپنے سَر لیا۔

۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان میں ہرپیے کے کینسر کی تشخیص ہوئی۔ سرجری کے بعد وہ صحت یاب ہو گئے۔ اپنے آخری برسوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اسلام آباد میں ایک کمیونٹی سینٹر کی غیر معمولی مدد کی اور اپنا بیشتر وقت بندروں کو کھلاتے پلاتے گزارا۔ جو لوگ ڈاکٹر عبدالقدیر کے بہت قریب رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان یہ سمجھتے تھے کہ اُنہوں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم دنیا جدید ترین ایٹمی ٹیکنالوجی کے معاملے میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔ اُن کی خواہش تھی کہ جدید ترین ایٹمی ٹیکنالوجی مسلم دنیا سمیت تمام غیر مغربی ملکوں تک پہنچے۔ اُن سے قربت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اُن کے خیال میں کسی بھی مسلم ملک کو ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کرنا کوئی جرم نہیں تھا۔ انہوں نے ۲۰۱۹ء میں کہا تھا کہ قوم کو اِس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ پاکستان ہر اعتبار سے محفوظ ایٹمی قوت ہے اور کوئی بھی اِس کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ (مترجم: ابوصباحت)

'Why not an Islamic bomb?': How Israel planned and failed to stop Pakistan going nuclear. ("middleeasteye.net". June 25, 2025)

بقیہ: یورپ: ٹینک تو اچھے ہیں لیکن چلائے گا کون؟

نتیجہ یہ ہے کہ یورپ ایک ایسا براعظم دکھائی دیتا ہے جو جنگ سے تھکا ہوا ہے، حالانکہ اس نے اصل میں کوئی جنگ لڑی ہی نہیں۔ امریکا میں ٹرمپ کے حامی پہلے ہی یورپیوں کی جنگی صلاحیت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امریکی نائب صدر جے ڈی وینس نے مارچ میں طنزیہ انداز میں کہا تھا کہ 'کوئی عام یورپی ملک، جو گزشتہ ۳۰ یا ۴۰ سال سے کسی جنگ میں شامل نہیں ہوا، یوکرین میں اپنے فوجی بھیج کر روس کو کیسے روک سکتا ہے؟' ان کا یہ بیان سخت ضرور تھا، مگر اس میں کچھ حقیقت بھی چھپی ہوئی تھی۔

یورپی ممالک کو اپنی دفاعی ذمہ داریوں پر زیادہ خرچ کرنے پر آمادہ کرنے میں امریکیوں کو کئی عشرے لگے ہیں۔ اب انہیں جنگ کی اہمیت پر قائل کرنے میں شاید اس سے بھی زیادہ وقت لگے۔ (مترجم: بن فاروق)

"Europe wants to show it's ready for war". ("The Economist". June 19, 2025)

بقیہ: چیٹ بوٹس ذہن کو ختم کر رہے ہیں!

معاملہ یہ رہا کہ وہ چیٹ جی پی ٹی و دیگر کے بہت زیادہ استعمال کے نتیجے میں معاملات کو سمجھنے اور اُس فہم سے مطابقت رکھنے والی سوچ پروان چڑھانے کی صلاحیت سے مطلق محروم ہو گیا۔ اُس کا ذہن ایسا الجھا کہ پھر اپنے طور پر کام کرنے کے قابل ہی نہ رہا۔

اور سوال محض سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو نقصان پہنچنے کا نہیں۔ چیٹ جی پی ٹی اور دیگر چیٹ بوٹس کے بہت زیادہ استعمال سے ذہنی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ حافظہ بھی متاثر ہوتا ہے اور ریفلیکسز بھی کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ خیالی دنیا میں رہنے لگتے ہیں۔ اُن کے لیے سائبر اسپیس ہی حقیقی دنیا بن جاتا ہے۔ بہت سوں کا یہ حال ہے کہ ڈاکٹر نے جو دوائیں تجویز کی تھیں، وہ تمام دوائیں لینا اُنہوں نے اِس لیے ترک کر دیا کہ چیٹ بوٹ نے اُنہیں ایسا کرنے کو کہا۔

سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ محض پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے لیے نہیں بلکہ ذاتی معاملات کے لیے بھی چیٹ بوٹس پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں اُن کے بہت سے فیصلے بالکل غلط اور بُودے ثابت ہوتے ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے ہم کس نوعیت کے بحران کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Researchers scanned the brains of ChatGPT users and found something deeply alarming". ("futurism.com". June 20, 2025)

بھارتی بحریہ نشانے پر

بھارت کی بحریہ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنا کر پاکستان کے لیے خطرات میں اضافہ کرنے کا عمل ایک زمانے سے جاری ہے۔ بھارتی قیادت کی کوشش رہی ہے کہ پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرات کو جتنا بھی بڑھایا جاسکتا ہے، بڑھایا جائے۔ دونوں ممالک کے درمیان دو باضابطہ جنگیں اور متعدد طویل جھڑپیں ہوچکی ہیں۔ بھارتی فوج حجم میں بھی بڑی ہے اور وسائل کے اعتبار سے بھی بہت بڑھ کر ہے مگر پھر بھی پاکستانی فوج کو نیچا دکھانے میں وہ مجموعی طور پر ناکام رہی ہے۔

بھارتی بحریہ کو جدید ترین بحری قوت میں تبدیل کرنے کے لیے بھارتی قیادت نے ۲۰۳۰ء تک ۲۴ جدید ترین آبدوزیں فراہم کرنے کا پروگرام ۱۹۹۹ء میں شروع کیا تھا۔ طے کیا گیا تھا کہ اِن میں ۶/ آبدوزیں ایٹمی ہتھیار لے جانے کی اہلیت کی حامل ہوں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بحرِ ہند اور بحیرۂ عرب میں بھارتی بحریہ کی حیثیت فیصلہ کُن نوعیت کی ہوجائے۔ بھارت ایک زمانے سے بحرِ ہند اور بحرالکاہل کے ملے جلے خطے اوشیانا میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے بے تاب رہا ہے۔ یہ پروگرام بہت حد تک ادھورا ہی نہیں بلکہ ناکام رہا ہے۔ اسٹریٹجک بنیاد پر تاخیر اور دیگر وجوہ کے باعث اِس پروگرام کو مکمل کرکے بھارتی بحریہ کو مضبوط تر بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کیا جاسکا ہے۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس پروگرام کے حوالے سے دفاعی ساز و سامان کی خریداری بھی تاخیر کی نذر ہوتی رہی ہے۔

اس حقیقت سے اب کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ بھارتی بحریہ کو غیر معمولی اور یقینی برتری حاصل کرنے کے قابل بنانے کا یہ پروگرام اب ناکام ہوچکا ہے۔ اِس کے نتیجے میں بھارتی بحریہ کو علاقائی بنیاد پر واضح برتری کا حامل بنانے کی خواہش بھی محض خواہش کے مرحلے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔

پراجیکٹ ۷۵ کے تحت اب تک اسکارپین کلاس کی صرف ۶/ آبدوزیں تیار کی جاسکی ہیں۔ یہ سب کچھ فرانس کے تکنیکی تعاون کی بدولت ممکن ہوسکا ہے۔ چھٹی اور اب تک کی آخری آبدوز آئی این ایس وَگشیر جنوری ۲۰۲۵ء میں بھارتی بحریہ میں شامل کی گئی۔

بھارتی بحریہ کی قیادت پریشان ہے کہ فورس کو مضبوط بنانے کا جو پروگرام ادھورا رہ گیا ہے، اُس کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کی تلافی کیونکر کی جائے۔ اس وقت بھارتی بحریہ کے پاس ۱۹/ آبدوزیں ہیں۔ ان میں سے ۱۶/ روایتی ڈیزل الیکٹرک یونٹس ہیں اور ۲ خانہ ساز نیوکلیئر پاورڈ بیلسٹک میزائل آبدوزیں ہیں۔ روس سے اکولا کلاس پلیٹ فارم حاصل کرنے کے لیے بات چیت جاری تھی مگر پھر یہ ہوا کہ روس نے یوکرین پر لشکر کشی کردی اور بین الاقوامی سطح پر عائد کی جانے والی پابندیوں کے باعث روس کے لیے ممکن نہ رہا کہ بھارت کو اکولا کلاس پلیٹ فارم دے۔

بھارت کے پاس اس وقت جتنی بھی روایتی ڈیزل الیکٹرک آبدوزیں ہیں، اُن میں سے بیشتر ۳۰ سال سے بھی زیادہ پُرانی ہیں۔ یہ آبدوزیں کسی بڑے حملے کی صورت میں بھرپور دفاع کی صلاحیت بھی پوری نہیں رکھتیں۔ ایسے میں اِن آبدوزوں کے ذریعے حملہ کرنے کے بارے میں سوچنے کی زیادہ گنجائش نہیں۔ دنیا بھر میں بحری قوت کو جدید ترین ہتھیاروں اور ساز و سامان سے مزیّن کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ بھارت جس خطّے میں واقع ہے، وہاں کئی ممالک کے پاس جدید ترین ٹیکنالوجی کی حامل آبدوزیں عام ہیں۔ جدید ترین ٹیکنالوجی سے آراستہ بحری قوتیں اپنے آپ کو منوانے کی راہ پر گامزن ہیں۔ ایسے میں بھارتی بحریہ ساز و سامان کے حوالے سے شدید بحرانی کیفیت کا شکار ہے۔

بھارتی بحریہ کو زیادہ طاقتور بنانے کے لیے جو ڈاکٹرائن تیار کی گئی تھی، اُس کے تحت بحری قوت کو جدید ترین رجحانات اور آلات کا حامل بنانے کا عمل مرحلہ وار مکمل کیا جانا تھا۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ جدید ترین آبدوزیں بیرونی معاونت کے بغیر گھر ہی میں تیار کی جائیں گی تاکہ دفاعی ساز و سامان کے لیے بیرونی ذرائع پر انحصار کم کیا جاسکے اور دفاعی تیاریوں کے حوالے سے خود انحصاری کا گراف اطمینان بخش حد تک بلند کیا جاسکے۔

اب مسئلہ یہ اُٹھ کھڑا ہوا ہے کہ بیوروکریسی معاملات کو تاخیر کی نذر کر رہی ہے۔ دفاعی ساز و سامان کی خریداری کا عمل بہت پیچیدہ اور تاخیر پیدا کرنے والا ہے۔ کسی بھی چیز کی خریداری کے لیے بیوروکریٹک طریق کار کے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں تاخیر ہوجاتی ہے اور زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اِس حوالے سے درکار سیاسی عزم بھی ناپید ہے۔ سیاسی جماعتیں دفاعی قوت میں اضافہ یقینی بنانے کے حوالے سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتیں اور فیصلے کرنے میں بہت دیر لگاتی ہیں۔

پراجیکٹ ۷۵ کے ذریعے بھارتی بحریہ میں ۶ جدید ترین ایئر انڈی پینڈنٹ پروپلشن آبدوزیں شامل کرنے کا خواب محض خواب ہے۔ اس حوالے سے کوئی واضح فیصلہ نہیں ہو پارہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت علاقائی اور عالمی حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ بھارتی بحریہ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کے لیے جدید ترین آبدوزیں اور دیگر سامان فراہم کیا جائے۔

پروگرام یہ ہے کہ اے آئی پی سے مزین آبدوزیں بھارتی ساحلوں سے بہت دور بین الاقوامی پانیوں میں زیادہ دیر تک رہیں گی اور اِس حوالے سے بھارتی بحری قوت میں ایسا اضافہ ممکن بنائیں گی جس کی بنیاد پر تھوڑی بہت علاقائی برتری یقینی بنائی جاسکتی ہے۔ بھارتی بحریہ چاہتی ہے کہ جنگ یا کسی اور بحرانی کیفیت میں اُس کی آبدوزیں زیادہ سے زیادہ وقت پانی میں رہنے کی صلاحیت وسکت رکھتی ہوں۔

بھارتی فوجی قیادت نے جنوری ۲۰۲۵ء میں میزاڈونگ ڈاک شپ بلڈرز لمیٹڈ (ایم ڈی ایل) کو بات چیت کے لیے بلایا تھا تاکہ قیمت کے حوالے سے کچھ طے کیا جاسکے۔ یہ پروگرام کم و بیش ۸/ ارب ۴۰ کروڑ ڈالر کا ہے۔ بھارتی بحریہ چاہتی ہے کہ قیمت کچھ کم کی جائے مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا۔ بات چیت میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ ٹیکنیکل معاملات میں اصولوں پر عمل پیرا نہ ہونے کے باعث لارسن اینڈ ٹوبروز کی بولی کے مسترد ہونے کے بعد (جس میں اسپین کی نیوانشیا بھی شریک تھی) ایم ڈی ایل کا پروپوزل ہی کارگر رہتا ہے۔ اس پروپوزل کو تھائسینکرپ میرین سسٹمز کی حمایت بھی حاصل ہے۔

بھارتی وزارتِ دفاع نے جنوری ۲۰۲۵ء میں کمرشل بولیاں کھولی تھیں۔ یہ عمل جولائی ۲۰۲۴ء میں فیلڈ ایویلیویشن ٹرائل کے نتائج آنے کے بعد شروع کیا گیا۔ اِس کے باوجود اب تک ایم ڈی ایل کو حتمی بات چیت کے لیے باضابطہ دعوت نامہ جاری نہیں کیا گیا ہے۔ معاملات جہاں تھے، وہیں دکھائی دے رہے ہیں۔

ایک عشرے قبل جب پراجیکٹ ۷۵ کا خاکہ تیار کیا گیا تھا تب اِس کا مجموعی بجٹ ۵/ ارب ۱۰/ کروڑ ڈالر تھا۔ افراطِ زر کے غیر معمولی دباؤ کے باعث اب مجموعی بجٹ بہت بڑھ چکا ہے۔ ایک بڑا مسئلہ شرحِ مبادلہ کا ڈانواڈول ہونا بھی ہے۔

علاوہ ازیں تکنیکی ضرورتیں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ اِس پر بھی اچھا خاصا خرچ ہونا ہے۔ اِن تمام عوامل نے اِس منصوبے کو بھارتی بحریہ کی تاریخ کا سب سے مہنگا منصوبہ بنا ڈالا ہے۔ اس منصوبے کے بارے میں معلومات کے حامل حلقوں کا کہنا ہے کہ جنوری میں ابتدائی بولی کے بعد وزارتِ دفاع کی خاموشی نے معاملات کو بہت الجھا دیا ہے۔ طریقِ کار کے جمود اور شفافیت کے حوالے سے متعلقہ انڈسٹری میں طرح طرح کے خدشات پائے جاتے ہیں۔

ہسپانوی ادارے نیویشیا نے بھارتی بحریہ میں آبدوزوں کی شمولیت اور اُن کی بہتر کارکردگی کے حوالے سے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ تھرڈ جنریشن اے آئی پی ٹیکنالوجی ۲۰۲۷ء تک کُھلے سمندر میں بھرپور کارکردگی کی آزمائش پر پوری اترے گی اور وسیع پیمانے پر ٹیکنالوجی کا ٹرانسفر بھی ممکن بنایا جائے گا۔ بھارتی بحریہ کے لیے یہ پیشکش بہت پُرکشش ہے کیونکہ بھارتی مسلح افواج ایک زمانے سے خود انحصاری کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔

ایل اینڈ ٹی نے اپنے اخراج یا مسترد کیے جانے پر اعتراضات رسمی طور پر جمع کروائے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لیونیشیا نے بھی ایسا ہی کچھ کیا ہے۔ اعتراض سے متعلق دستاویز میں اِس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بھارتی بحریہ نے اُس کے دیے ہوئے اے آئی پی سولیوشن کو زمینی پروٹوٹائپ کی بنیاد پر پرکھا جبکہ جرمنی کے سمندر میں آزمائش پر پورے اُترے ہوئے ڈیزائن کو قبول کرلیا گیا۔

اب ایم ڈی ایل اور ایل اینڈ ٹی کو لاگت سے متعلق حتمی مذاکرات کے لیے بلانے پر زور دیا جارہا ہے۔ وزارتِ دفاع کے حکام کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے کسی ایک وینڈر پر بہت زیادہ انحصار کرنے کی روایت کا خاتمہ ہوگا اور مسابقتی لاگت یا قیمت کی صورت میں بہتر آپشنز پر عمل کیا جاسکے گا۔ اس وقت بھارتی بحریہ کو دفاعی ساز وسامان کے حصول کے معاملے میں لاگت کے پہلو کو بھی ذہن نشین رکھنا ہے۔ کم از کم خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ جدید ترین ساز وسامان کا حصول یقینی بنانا ہے۔

ایک طرف تو بھارتی بحریہ کے لیے آبدوزوں کے علاوہ مختلف النوع دفاعی ساز و سامان اور ٹیکنالوجی کا بحران سر اٹھا رہا ہے اور دوسری طرف پاکستان اپنی بحری قوت میں بہت تیزی سے اضافہ کررہا ہے۔ اس معاملے میں اُسے چین کی بھرپور مدد حاصل ہے۔ اپریل ۲۰۲۵ء میں پاکستان کو چین سے دوسری ہینگور کلاس آبدوز ملی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان اے آئی پی سے مزین ۸ جدید ترین بوٹس کا معاہدہ موجود ہے جس کی مالیت ۵؍ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔

ان ہینگور کلاس آبدوزوں میں جدید ترین ہتھیار نصب ہیں۔ یہ کسی بھی نوع کی معرکہ آرائی کے دوران بھرپور دفاعی اور جوابی کارروائی کی صلاحیت کی حامل ہیں۔ اِن میں سونر سسٹم بھی ہے اور تادیر مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی۔ پاکستانی بحریہ اِس وقت بھارت کی طرف سے کی جانے والی کسی بھی کارروائی کے لیے پوری طرح تیار ہے اور بھارتی بحریہ کی کسی بھی غیر ضروری مہم جُوئی کی صورت میں اُس کے لیے سُبکی کا اچھا خاصا سامان ہوسکتا ہے۔

پاکستان کو چین سے تمام ۸؍آبدوزیں ایک عشرے کے دوران ملیں گی۔ اِس کے نتیجے میں پاکستانی بحریہ کا آبدوزوں کا بیڑا غیر معمولی صلاحیت و سکت کا حامل ہو جائے گا۔ بھارتی کُھلے اور گہرے پانیوں میں آزادانہ نقل و حرکت یقینی بنانے والی آبدوزیں سامنے لانا چاہتا ہے۔ اِس راہ میں اب پاکستان ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستانی بحریہ بحری معرکہ آرائی میں بھی اب بھارت کو منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

چین نے حال ہی میں پاکستانی بحریہ کو ۴ ٹائپ 054A/P فریگیٹس دیے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں اب چین اور پاکستان مل کر بھارتی بحریہ کی کسی بھی نوع کی مہم جُوئی کا منہ توڑ جواب دینے کی بھرپور صلاحیت کے حامل ہیں۔ یہ بحیرۂ عرب میں بھارت کی مفروضہ بالادستی کے لیے بھی بہت بڑا چیلنج ہے۔

چین خود بھی بحرِ ہند کے خطے میں اپنی دسترس بہتر بنا کر امکانات کا دائرہ وسیع کرنا چاہتا ہے۔ سری لنکا اور مالدیپ سے اُس کی گہری ہم آہنگی ہے اور پاکستان کے ساتھ اُس کا دفاعی اشتراکِ عمل اب غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ گوادر میں بندرگاہ تعمیر کرکے چین نے پاکستان کے ساتھ ایسے تعلق کو جنم دیا ہے جو تجارتی اور دفاعی، دونوں ہی اعتبار سے انتہائی اہم ہے اور یہ سب کچھ بھارت کے لیے بھی پریشان کُن ہے اور ایران کے لیے بھی۔ بھارت نے چابہار کی بندرگاہ کے ذریعے جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ حاصل نہیں کیا جاسکا ہے۔

اِس وقت چین جو کچھ کررہا ہے، اُس سے یہ تاثر پروان چڑھ رہا ہے کہ وہ بھارت کو گھیر رہا ہے۔ بھارتی بحریہ پر شدید دباؤ ہے۔ بھارتی فضائیہ بھی معرکہ آرائی میں بُودی ثابت ہوچکی ہے۔ بھارت کی بری افواج کے لیے کچھ کر دکھانے کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ وہ اندرونِ ملک شورش اور مزاحمت کچلنے تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ چین اور پاکستان کے ہاتھوں گھیرے جانے کا احساس بھارت کے لیے غیر معمولی نوعیت کی مشکلات پیدا کررہا ہے۔ ایک طرف سیاسی دباؤ ہے اور دوسری طرف دفاعی و معاشی معاملات بھی الجھے ہوئے ہیں۔ بھارتی کو کُھلے سمندر میں بیشتر راستوں پر چین کی طرف سے غیر معمولی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ دنیا بھر کے دفاعی تجزیہ کاروں اور تحقیقی اداروں کی رپورٹس اور تجزیوں کے مطابق چین ۶۵؍آبدوزوں کے ساتھ بھارت کے لیے پریشان کن حالات پیدا کرنے کی راہ پر گامزن ہے جبکہ ۲۰۳۵ء تک آبدوزوں کی تعداد ۸۰ تک پہنچا دیے جانے کا بھی امکان ہے۔

بھارتی بحریہ آبنائے ملاکا، بحیرۂ انڈمان اور گریٹر انڈین اوشن ریجن میں کھل کر کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں کیونکہ اُس کا اپنا ایس ایس این فلیٹ آپریشنل نہیں ہو پارہا۔ ایسے میں اپنے وسائل سے ڈیزل الیکٹرک آبدوز کی پروڈکشن تو بہت دور کی منزل معلوم ہوتی ہے۔ یہ تمام معاملات بھارتی بحریہ کو بہت حد تک ہدف پذیر بناتے ہیں۔

ایس ایس این زکے ذریعے غیر معمولی سطح پر آپریشن کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اسٹریٹجک لیک بھی ممکن بنائی جاسکتی ہے۔ دور تک نظر رکھنے کی صلاحیت بھی پروان چڑھائی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آبدوز شکن جنگی ساز وسامان کے استعمال کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ بھارتی بحریہ اس وقت گومگو کی کیفیت سے دوچار ہے اور دستیاب وسائل کو بھی ڈھنگ سے بروئے کار لانے سے قاصر ہے۔ موجودہ ڈھانچا بعض معاملات میں شدید کمی اور خامی کا سامنا کررہا ہے۔

چین کے بحیرۂ جنوبی چین کے بیڑے کی طرف سے بھی بھارتی بحریہ کے لیے چیلنجز میں اضافہ ہو رہا ہے اور اِدھر پاکستان بھی اپنی بحریہ کو بہت تیزی سے تجدید کے مرحلے سے گزار رہا ہے۔ ایسے میں بھارتی بحریہ کو ایک طرف تو پلیٹ فارمز کی تعداد میں کمی کے حوالے سے مشکلات کا سامنا ہے اور دوسری طرف سینسر فیوژن، نیٹ ورکنگ کے ساتھ مقابلے کرنے کی صلاحیت اور حساس معلومات، نگرانی اور خفیہ سرگرمیوں کے حوالے سے مشکلات درپیش ہیں۔ بھارت اب تک اس معاملے میں تھوڑی سی برتری کا حامل رہا ہے مگر اب وہ برتری بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

بھارتی بحریہ کے لیے آبدوزوں کے تیس سالہ روڈ میپ کے مطابق ڈلیور کرنے میں ناکامی محض جنگی ساز وسامان کی خریداری کے حوالے سے ناکامی نہیں ہے بلکہ اِس کے نتیجے میں بھارتی فوج اسٹریٹجک نقطۂ نگاہ سے ہدف پذیر ہوچکی

ہے۔ اِس سے بھارتی بحریہ کی ردِ جارحیت کی صلاحیت کا گراف نیچے آئے گا اور وہ اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے میں ناکام رہے گی۔

اگر بحریہ کی کارکردگی بہتر بنانی ہے، اُس کی مقابلہ کرنے اور حملے کرنے کی صلاحیت کا گراف بلند کرنا ہے تو لازم ہے کہ فیصلہ سازی کی قوت بہتر بنائی جائے اور اس حوالے سے بھارتی قیادت کو تیزی سے اور بروقت فیصلے کرنے ہوں گے۔ بھارتی قیادت کو ایٹمی آبدوزوں کے پروگرام میں زیادہ سرمایہ لگانا پڑے گا اور وہ بھی جلد از جلد۔ پاکستان اور چین کا بحری سطح پر اشتراکِ عمل بھی بھارت کے لیے بہت بڑا خطرہ اور مستقل دردِ سر ہے۔ اگر بھارت کی سیاسی اور عسکری قیادت نے اِس حوالے سے فیصلوں میں تاخیر کی تو معاملات بہت بگڑ جائیں گے اور بہت کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

بھارت کے پالیسی ساز بھارت اور بحرالکاہل کے خطے کے ممالک کے درمیان اشتراکِ عمل، کُھلے اور گہرے سمندروں میں بحریہ کی قوت بڑھانے، علاقائی سطح پر قیادت سنبھالنے اور بھارت کو عظیم تر بنانے کی باتیں کرتے ہیں مگر جو کچھ وہ سوچتے ہیں اور ڈاکٹرائن کی شکل میں پیش کرتے ہیں، اُس میں اور میدانِ عمل کے لیے ہارڈ ویئر کی سطح پر تیاری میں بہت واضح فرق دکھائی دے رہا ہے۔ یہ فرق اتنا زیادہ ہے کہ اِسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بحرِ ہند میں برتری کا حصول یقینی بنانے کا معاملہ طیارہ بردار جہازوں اور سطحِ زمین پر تباہ کن جہازوں کے استعمال تک محدود نہیں ہے۔ بہت کچھ پسِ پردہ بھی ہوتا ہے اور ہونا ہی چاہیے۔ بھارتی بحریہ اِس حوالے سے کمزور پڑ گئی ہے۔

بھارتی قیادت پر لازم ہو چکا ہے کہ اپنی بحریہ کی آبدوز سے متعلق حکمتِ عملی کو اکیسویں صدی کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگ کرے۔ اکیسویں صدی کی جنگ محض ہتھیاروں سے نہیں بلکہ حکمتِ عملی اور خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے بھی لڑی جاتی ہے۔ بھارتی قیادت کو یہ بات کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے، بھولنی نہیں چاہیے کہ اُس کے چین اور پاکستان پوری تیاری کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اُن کی طاقت کے بارے میں غلط اندازے قائم کرنا یا خوش فہمی میں مبتلا ہونا انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا۔ (مترجم: ابوصباحت)

"India's submarine strategy in crisis: Delays sink naval ambitions as Pakistan-China axis surges underwater". ("defencesecurityasia.com". June 26, 2025)

اسرائیل کا جوہری پروگرام: پردہ اُٹھانے کی ضرورت

افتخار گیلانی

اگرچہ اسرائیل نے سخت رازداری قائم رکھی ہے، تاہم جوہری ماہرین کے درمیان اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ اسرائیل ایک جوہری طاقت ہے۔ مگر شفافیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں، حکمت عملیاں اور خطرے کی حدود اب بھی اندھیرے میں چھپی ہیں۔ یہ ابہام ایک طرف دشمنوں کو باز رکھنے کا ذریعہ ہے، تو دوسری طرف کھلے اعتراف سے بچنے کا طریقہ ہے۔

پوکھرن میں جوہری تجربات کے چار ماہ بعد وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۹۸ء کو نیویارک آپہنچے تھے۔ منموہن سنگھ اور موجودہ وزیراعظم نریندر مودی کے برعکس ان کے کام کا طریقہ نہایت آسان، سست مگر چست ہوتا تھا۔ وہ صرف کام اور کام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

بالعموم وہ شام کو کوئی اپائنٹمنٹ نہیں رکھتے تھے اور دن میں بھی لنچ کے بعد وہ وزیراعظم ہاؤس کے احاطہ میں موجود رہائشی بنگلہ میں قیلولہ کرنے چلے جاتے تھے۔ اس لیے بیرون ملک ان کے سرکاری دورے تین دن کے بجائے پانچ دن کے رکھے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ میڈیا ٹیم کے مزے ہوتے تھے۔

ایک تو وہ خود بھی ملنا جلنا پسند کرتے تھے۔ پھر چونکہ ان کی تین یا چار سے زیادہ اپائنٹمنٹ نہیں ہوتی تھیں، اس لیے میڈیا ٹیم کو اس شہر کو دیکھنے اور خریداری کرنے کے بھرپور مواقع فراہم ہوتے تھے۔

یہ عیاشیاں سنگھ کے دور میں نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ ان کے کام کاج کا اسٹائل ہی اذیت بھرا ہوتا تھا۔ مودی نے ویسے تو میڈیا ٹیم کو ساتھ لینا ہی بند کر دیا، مگر ان کا بھی ورک اسٹائل منموہن سنگھ جیسا خود گزیدہ ہے۔

خیر نیویارک کے اس دورہ کے دوران ان کی اسرائیلی وزیراعظم بنجمن نیتن یاہو سے ملاقات طے تھی۔ نیتن یاہو بھی پہلی بار ۱۹۹۶ء میں وزیراعظم کی کرسی پر فائز ہوگئے تھے۔ میڈیا ٹیم کو بتایا گیا کہ وزیراعظم کی ملاقاتوں کے حوالے سے دوپہر کو بریفنگ ہوگی اور تب تک ہندوستانی سفارت خانے نے ان کے لیے شہر گردی کا پروگرام رکھا ہوا ہے۔

ایک ہندی اخبار کے ایڈیٹر کا اپنا کوئی پروگرام تھا، اس لیے انہوں نے اس ٹیم میں شمولیت نہیں کی۔ اسی ہوٹل کے ایک سیوٹ میں نیتن یاہو کو وزیراعظم واجپائی کا استقبال کرنا تھا۔ جب یہ ایڈیٹر باہر جانے کے لیے لابی میں آئے، تو واجپائی دروازے سے اندر آرہے تھے۔ چونکہ وہ خاصے یار باش شخص تھے اور ایڈیٹر صاحب کو ایک عرصے سے جانتے تھے، انہوں نے ان کا حال چال پوچھا اور ہاتھ پکڑ کر سیوٹ میں اپنے ساتھ لے گئے، جہاں نیتن یاہو ان کا انتظار کر رہے تھے۔

اسرائیلی وزیراعظم نے واجپائی کا استقبال کرتے اور ان کو گلے لگاتے ہوئے کہا:

مسٹر پرائم منسٹر، اب آپ نیوکلیر ہیں، ہم نیوکلیر ہیں، کیوں نہ ہم اس طرح (گلے لگتے ہوئے) پاکستان کو کرش کریں۔

بھارتی وزارت خارجہ کے افسران کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اسرائیلی وزیراعظم پہلی بار نیوکلیر ہونے کا اعلان ایک صحافی کے سامنے کر رہے تھے۔ واجپائی ابھی بھی ایڈیٹر صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور ان کو اپنے پاس ہی بٹھایا ہوا تھا۔

خیر سفارت خانے کے کسی افسر کی دماغ کی بتی جل گئی، انہوں نے ایڈیٹر صاحب سے کہا کہ باہر استقبالیہ پر آپ کا فون آیا ہے۔ ان کو باہر لے جاکر دروازہ بند کروا دیا۔ ان کو تاکید کی گئی کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا اور سنا، اس کی تشہیر نہیں ہونی چاہیے اور سرگوشیوں میں بھی کبھی یہ سننے میں نہیں آنا چاہیے، ورنہ ان کو نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

ایڈیٹر صاحب اور میڈیا ٹیم میں جن افراد کو بھنک مل گئی تھی، نے بھی اس کی کسی کو ہوا لگنے دی نہ کبھی اس کو اخبارات کی زینت بنایا۔

خیر جس طرح خاص طور پر مغربی دنیا ابھی ایران اور شمالی کوریا اور ماضی میں پاکستان اور بھارت کے ایٹمی پروگرام پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھی تھی، اب وقت آگیا ہے کہ ان کو اسرائیل کے مبہم اور غیر علانیہ ایٹمی ذخیرہ کا بھی نوٹس لینا چاہیے۔ کیونکہ جس طرح کے غیر ذمہ دار قائدین اس وقت تل ابیب میں برسر اقتدار ہیں، وہ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔

اسی ایٹمی ذخیرہ کی سیکورٹی اور اس کے غلط استعمال کو روکنا بین الاقوامی سفارت کاری کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ ویسکونسن پروجیکٹ آن نیوکلیئر آرمز کنٹرول کے مطابق

اسرائیل کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ان کے ذخیرے کا اندازہ ۹۰ سے لے کر ۴۰۰ وار ہیڈز تک لگایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اسرائیل نے ایک مکمل ایٹمی سہ جہتی نظام (ٹرایاڈ) تیار کر لیا ہے، ایف۔۱۵ اور ایف۔۱۶ لڑاکا طیاروں سے بم گرانے کی صلاحیت، ڈولفن کلاس آبدوزوں سے کروز میزائل داغنے کی صلاحیت اور بین البراعظمی مار کرنے والی 'یریکو' میزائل سیریز ان کی اسلحہ انونیٹری میں شامل ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اسرائیل نے اپنا پہلا قابلِ استعمال ایٹمی ہتھیار ۱۹۶۶ء کے آخر یا ۱۹۶۷ء کے اوائل میں تیار کر لیا تھا، جو اسے دنیا کی آٹھویں ایٹمی قوت بناتا ہے۔اس کے باوجود اسرائیل نے 'مبہم پالیسی' اختیار کر رکھی ہے۔۔۔ نہ کبھی تصدیق نہ انکار کیا۔

اس مبہم پالیسی کو حالیہ دنوں میں ایران پر اسرائیل کے بڑے پیمانے پر فضائی حملوں کے بعد ایک بار پھر توجہ ملی ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق، یہ نہ صرف تہران بلکہ پورے خطے کو اسرائیل کی روایتی اور ممکنہ ایٹمی صلاحیتوں کا پیغام تھے۔

جوہری امور کی ماہر سوزی سنائیڈر نے اس حوالے سے کہا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا اسرائیل کے ایٹمی پروگرام پر بھی بات کرے، جو خطے کے لیے ایک خطرہ ہے۔عالمی شفافیت کے مطالبوں کے باوجود، اسرائیل نے آج تک ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے (این پی ٹی) پر دستخط نہیں کیے۔

اس کا مؤقف ہے کہ علاقائی امن اور باہمی اسلحہ کنٹرول کے معاہدے اس سے پہلے ہونے چاہئیں۔یہی مؤقف اسے بین الاقوامی معائنے کے نظام سے باہر رکھتا ہے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ ایران کے جوہری پروگرام کی بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی مسلسل مانیٹرنگ کرتی ہے، مگر اسرائیلی جوہری پروگرام تک اس کی رسائی ہے نہ ہی اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

حالیہ برسوں میں اسرائیلی حکام کے بیانات سے اس کی صلاحیتوں کو زیادہ واضح طور پر تسلیم کرنے کے اشارے ملے ہیں۔۲۰۲۳ء میں اُس وقت کے وزیر ایمیحائی ایلیاہو، نے غزہ پر ایٹم بم استعمال کرنے کی تجویز دی تھی، جس پر انہیں وزیراعظم نیتن یاہو نے معطل کر دیا۔

اگرچہ اس بیان کی سرکاری طور پر تردید کی گئی، مگر اس نے اسرائیل کے ایٹمی ارادوں اور تیاریوں کے بارے میں شکوک وشبہات کو مزید تقویت دی۔

اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کی تاریخ ۱۹۴۸ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔فرانس کی مضبوط پشت پناہی اور خفیہ ذرائع سے ضروری مواد اور ٹیکنالوجی حاصل کر کے، اسرائیل نے 'دیمونا' میں نیگیو نیوکلیئر ریسرچ سینٹر تعمیر کیا۔۱۹۸۶ء میں ایک وسل بلور خائی وانونو کے انکشافات نے اس پروگرام کی پہلی جھلک دنیا کے سامنے رکھی، جس میں ایڈوانس ہتھیاروں کے ڈیزائن، بشمول تھرمونیوکلیئر وار ہیڈز کی تصاویر شامل تھیں۔

وانونو کو بعد میں اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے روم سے اغوا کر کے اسرائیل لا کر غداری کے الزام میں سزا دلوا دی۔ نامور مؤرخ ایویز کوہن کے مطابق، اسرائیل نے ۱۹۶۶ء میں باضابطہ طور پر اپنی ایٹمی پالیسی تشکیل دی۔اس کی نیوکلیر ڈاکٹرائن میں چار ریڈ لائنز متعین کی گئیں۔ان میں اسرائیل کی ۱۹۶۷ء سے پہلے کی سرحدوں میں فوجی مداخلت، اسرائیلی فضائیہ کی مکمل تباہی، اسرائیلی شہروں پر زہریلی گیس یا حیاتیاتی ہتھیاروں سے مہلک فضائی حملے، اور اسرائیلی سرزمین پر ایٹمی حملہ شامل ہیں۔

معروف صحافی سیمور ہرش نے اپنی کتاب 'دی سیمسن آپشن' میں دعویٰ کیا کہ اسرائیل ۱۹۷۳ء کی یوم کپور جنگ کے دوران ایٹم بم کو استعمال کرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ۸/اکتوبر کو، جنگ کے چند دن بعد، وزیراعظم گولڈا میئر اور ان کے مشیروں نے مبینہ طور پر آٹھ جوہری ہتھیاروں سے لیس ایف۔۴ فینٹم طیاروں کو 'تل نوف' ایئربیس پر ہمہ وقت الرٹ پر رکھا ہوا تھا۔اسی دوران 'سدوت میخا' بیس پر جوہری میزائل لانچرز بھی فعال کیے گئے تھے۔

ہرش کے مطابق، اسرائیل کے ابتدائی اہداف میں قاہرہ اور دمشق میں مصری اور شامی فوجی ہیڈکوارٹر شامل تھے۔ یہ الرٹ محض دفاعی نہیں تھا بلکہ سوویت یونین کے لیے پیغام تھا کہ وہ اپنے عرب اتحادیوں کو لگام دے، اور امریکا پر دباؤ ڈالنا تھا تاکہ وہ اسرائیل کی بکھری ہوئی فوج کے لیے بھاری فوجی امداد فراہم کرے۔

بتایا جاتا ہے کہ ایک سوویت انٹیلی جنس افسر نے مصر کے فوجی سربراہ کو اسرائیلی ایٹمی تیاریوں سے آگاہ کیا تھا۔ادھر امریکی قومی سلامتی کے مشیر ہنری کسنجر کے قریبی افراد نے بعد میں تسلیم کیا کہ جوہری خطرے کے خدشے نے واشنگٹن کو فوجی امداد کے جلد آغاز پر مجبور کر دیا۔

کسنجر کے سوانح نگار مارٹن انڈک کے مطابق اسرائیل کی ناقابلِ تسخیریت کے بھرم کو توڑنے کے لیے اس جنگ کے ابتدائی دنوں میں امریکا نے مداخلت سے گریز کیا تھا اور مصر کو پوری آزادی دی۔اسرائیل کے دماغ میں دوبارہ بٹھایا گیا کہ اس کا وجود امریکا کے مرہونِ منت ہے۔

ہرش کا مزید کہنا ہے کہ سیٹلائٹ نگرانی کی صلاحیت حاصل کرنے سے پہلے، اسرائیل نے سوویت اہداف کی معلومات امریکا کی خفیہ ایجنسیوں کی جاسوسی کر کے حاصل کی تھیں۔۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ میں جب عراق نے اسرائیل پر اسکڈ میزائل داغے، اسرائیل نے مکمل ایٹمی الرٹ نافذ کر دیا تھا۔ممکنہ کیمیائی یا حیاتیاتی حملے کے خدشے کے تحت جوہری صلاحیت والے موبائل میزائل لانچرز تعینات کیے گئے۔اگرچہ اسرائیل نے امریکی دباؤ کے تحت جوابی کارروائی سے گریز کیا، لیکن یہ لمحہ بھی ایک سنجیدہ جوہری غور وفکر کی مثال بن گیا۔

اسی طرح ۲۰۰۳ء میں بھی امریکی صدر جارج بش کو اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون نے خبردار کیا تھا کہ اگر اسرائیل کو بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوا، تو اسرائیل ایٹمی اسلحہ کا استعمال کر سکتا ہے۔

فوجی تجزیہ کار اور منصوبہ ساز تسلیم کرتے ہیں کہ اگرچہ اسرائیل کی جوہری پالیسی کبھی باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کی گئی، لیکن یہ قومی سلامتی کے اصولوں کا بنیادی جزو بن چکی ہے۔

لوئس رینی بیرس، جو 'پروجیکٹ ڈینیئل' کے نمایاں رکن ہیں، نے اس پالیسی کو مزید مضبوط بنانے کی وکالت کی ہے۔ ان کے مطابق، اسرائیل کو اپنی حکمت عملی امریکی پنٹاگون کی 'ڈاکٹرائن فار جوائنٹ نیوکلیئر آپریشنز' کے مطابق رکھنی چاہیے، جو پیشگی حملے پر زور دیتی ہے۔اسرائیل کی جوہری صلاحیتوں کے بارے میں دانستہ ابہام اب بھی ایک مؤثر سفارتی ڈھال کا کام دے رہا ہے۔

مگر مشرقِ وسطیٰ کی بدلتی ہوئی صورتحال میں، جہاں غیر روایتی خطرات اور ہائبرڈ جنگوں کا خطرہ بڑھ رہا ہے، ماہرین کا خیال ہے کہ پرانی 'ریڈ لائنز' بھی بدل سکتی ہیں۔ان کے ساتھ ایٹمی استعمال کا خطرہ بھی حقیقت بن چکا ہے۔

اسرائیل کے رہنماؤں نے متواتر ایٹمی ہتھیاروں کو قومی بقا کا آخری سہارا قرار دیا ہے، اور اکثر ہولوکاسٹ کے ساتھ اس کو نتھی کیا جاتا ہے۔'سیمسن آپشن' یعنی بڑے خطرے کی صورت میں زبردست جوابی کارروائی اسی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔

اسی طرح ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بنائی گئی 'بیگن ڈاکٹرائن' کے تحت اسرائیل کسی بھی دشمن ریاست کو جوہری ہتھیار حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔اسی اصول کے تحت عراق کا 'اوسیرک' ری ایکٹر ۱۹۸۱ء میں، شام کی ممکنہ جوہری تنصیب

۲۰۰۷ء میں، اور ایران کے 'نطنز' پلانٹ پر 'اسٹکس نیٹ' سائبر حملہ ۲۰۱۰ء میں کیا گیا۔ اب حال میں ایران پر حملوں کا جواز بھی یہی ڈاکٹرائن فراہم کرتی ہے۔

اسرائیل مسلسل اپنے جوہری پروگرام کو بین الاقوامی جانچ سے بچاتا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ اور انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کی قراردادوں میں، عرب ممالک اور دیگر غیر وابستہ ریاستیں مسلسل اسرائیل پر زور دیتی رہی ہیں کہ وہ این پی ٹی یعنی جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے میں شامل ہو کر اپنے جوہری اثاثے عالمی معائنے کے لیے کھول دے۔ مگر اسرائیل امریکا کی پشت پناہی کے باعث ڈٹا ہوا ہے۔ امریکا کے ساتھ ایک غیر علانیہ مفاہمت کے تحت، اسرائیل جوہری ہتھیار کا تجربہ کرتا ہے، نہ اس کا اعلان کرتا ہے۔

اس کے باوجود اسرائیل کے ایٹمی 'ڈیلیوری سسٹمز' ایک خطرناک سہ جہتی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ماہرین کے مطابق، ریکو-III میزائل بیک وقت کئی اہداف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور بین البراعظمی مار کر سکتے ہیں۔

اسرائیلی فضائیہ کے ترمیم شدہ ایف-۱۵ اور ایف-۱۶ طیارے دور دراز اہداف پر حملہ کر سکتے ہیں، جیسا کہ عراق، شام اور اب ایران میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔ جرمن ساختہ ڈولفن کلاس آبدوزیں جوہری صلاحیت والے کروز میزائل سے لیس ہیں، جو 'سیکنڈ اسٹرائیک' کی صلاحیت فراہم کرتی ہیں۔ جہاں واشنگٹن ایران پر تو سختی کرتا ہے مگر اسرائیل کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔

اب یہ دہرا معیار نہیں تو کیا ہے۔ ۲۰۰۹ء میں سابق امریکی صدر جمی کارٹر نے اندازہ لگایا تھا کہ اسرائیل کے پاس ۳۰۰ سے زائد وار ہیڈز ہو سکتے ہیں۔ 'بلیٹن آف اٹامک سائنٹسٹس' کے حالیہ جائزے میں اس تعداد کو تقریباً ۸۰ بتایا گیا ہے، مگر مزید ہتھیار بنانے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔

اسرائیلی پروگرام کو ابتدائی طور پر غیر ملکی مدد سے فروغ ملا۔ فرانس نے دیمونا ری ایکٹر کی تعمیر اور ری پروسیسنگ ٹیکنالوجی فراہم کی۔ برطانیہ اور ناروے نے خفیہ یا بالواسطہ طریقوں سے بھاری پانی اور یورینیم مہیا کیا۔ جنوبی افریقا سے بھی ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جوہری تعاون کے شواہد موجود ہیں۔

اگرچہ اسرائیل نے سخت رازداری قائم رکھی ہے، تاہم جوہری ماہرین کے درمیان اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے کہ اسرائیل ایک جوہری طاقت ہے۔ مگر شفافیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں، حکمت عملیاں اور خطرے کی حدود اب بھی اندھیرے میں چھپی ہیں۔ یہ ابہام ایک طرف دشمنوں کو باز رکھنے کا ذریعہ ہے، تو دوسری طرف کھلے اعتراف سے بچنے کا طریقہ ہے۔

لیکن ناقدین کے مطابق، یہ خطے میں اسلحہ کنٹرول کی کوششوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور خاص طور پڑوسی ممالک میں عدم تحفظ کو فروغ دیتا ہے۔ جہاں ایران کا ۶۰ فیصد یورینیم افزودہ کرنا پابندیوں اور دھمکیوں کا سبب بنتا ہے، وہاں اسرائیل کے درجنوں یا سیکڑوں جوہری ہتھیار سفارتی سطح پر سوال سے بھی بچے رہتے ہیں۔

لیکن جیسے جیسے مشرقِ وسطیٰ میں کشیدگی بڑھ رہی ہے اور سیاسی بیانیے میں ایٹمی خطرات دوبارہ ابھر رہے ہیں، اسرائیل کے ایٹمی پروگرام پر دہائیوں سے چھایا ہوا سکوت اب برقرار رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی بدلتی ہوئی تزویراتی زمین، ایران کے ساتھ کشیدگی کا عروج، اور عالمی سطح پر جوہری خطرات کے دوبارہ سر اٹھانے کے بعد، یہ تقاضا شدت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ جوہری مساوات میں دوہرا معیار ختم ہونا چاہیے۔

اگر ایران، شمالی کوریا یا کسی اور ملک کی ایٹمی سرگرمی پر دنیا کی نظریں فوری طور پر مرکوز ہو جاتی ہیں، تو اسرائیل جیسے غیر علانیہ جوہری طاقت کو مسلسل استثنیٰ دینا نہ صرف علاقائی استحکام کے لیے خطرہ ہے بلکہ عالمی اصولوں کی ساکھ کے لیے بھی ایک تازیانہ ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اسرائیل کی جوہری حقیقتوں پر سے بھی وہ پردہ ہٹایا جائے، جس نے ایک خاموش مگر مہلک خطرے کو برسوں سے عالمی نظروں سے چھپائے رکھا ہے۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۸؍جون ۲۰۲۵ء)

برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ

سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' علی گڑھ (بھارت)

اب پاکستان میں دستیاب ہے

زرِتعاون فی شمارہ: ۴۰۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

تازہ شمارہ (جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء) حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

اسلامک ریسرچ اکیڈمی

ڈی-۳۵، بلاک-۵، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰، ۰۳۳۴-۳۹۱۲۷۶۹

بقیہ: غزہ: امدادی مراکز میں موت بانٹتی اسرائیلی فوج

آئی ڈی ایف کے ترجمان نے اس تنقید کے جواب میں بیان دیا کہ ''حماس ایک سفاک دہشت گرد تنظیم ہے جو غزہ کی آبادی کو بھوکا رکھتی ہے اور انہیں خطرے میں ڈالتی ہے تاکہ اپنی حکمرانی کو برقرار رکھ سکے۔ حماس ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ غزہ میں خوراک کی کامیاب تقسیم کو روکا جائے۔ اسرائیلی فوج امریکی سول سوسائٹی تنظیم (جی ایچ ایف) کو آزادانہ طور پر کام کرنے اور غزہ کے شہریوں میں امداد تقسیم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ فوج نئے امدادی مراکز کے آس پاس اپنی کارروائیاں جاری رکھتے ہوئے خوراک کی تقسیم کو یقینی بنانے کے لیے وہاں موجود ہوتی ہے'۔

فوج نے مزید کہا ہے کہ خوراک کی تقسیم کے مرکزی راستوں کے اردگرد تعینات اسرائیلی افواج علاقے میں اپنی کارروائیوں کے اثرات کو کم کرنے اور شہری آبادی کے ساتھ ممکنہ ٹکراؤ سے بچنے کی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ فوج نے بتایا کہ حال ہی میں انہوں نے نئی باڑ نصب کی، سائن بورڈز لگائے، اضافی راستے کھولے اور دیگر اقدامات کیے تاکہ امدادی عمل کو بہتر بنایا جا سکے۔

آئی ڈی ایف کے مطابق شہریوں پر فائرنگ کے واقعات کی تفصیلی تحقیقات کی گئیں اور میدان جنگ میں تعینات افواج کو نئے احکامات جاری کیے گئے، جن کی بنیاد ان واقعات سے حاصل شدہ اسباق پر رکھی گئی۔ ان واقعات کو جنرل اسٹاف کے 'ڈی بریفنگ میکنزم' کے حوالے بھی کیا گیا ہے تاکہ ان کا جائزہ لیا جا سکے۔

اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد اسرائیلی فوج نے ایک اضافی بیان جاری کرتے ہوئے رپورٹ میں لگائے گئے الزامات کو سختی سے مسترد کیا۔ بیان میں کہا گیا کہ ''اسرائیلی فوج نے کبھی بھی اپنی اہلکاروں کو شہریوں، بشمول ان افراد کے جو امدادی مراکز کی طرف جا رہے تھے، پر جان بوجھ کر فائرنگ کرنے کی ہدایت نہیں دی۔ واضح رہے کہ اسرائیلی فوج میں شہریوں پر دانستہ حملوں کی ممانعت ہے''۔

فوج نے مزید کہا کہ ''قوانین یا فوج کی ہدایات سے کسی بھی انحراف کے الزام کی مکمل جانچ کی جائے گی اور ضرورت پڑنے پر مزید اقدامات کیے جائیں گے۔ شہریوں پر جان بوجھ کر فائرنگ کے جو الزامات اس رپورٹ میں بیان کیے گئے ہیں، انہیں فیلڈ میں نہیں دیکھا گیا۔ (ترجمہ: زید احمد)

'It's a killing field': IDF soldiers ordered to shoot deliberately at unarmed Gazans waiting for humanitarian aid". ("haaretz.com". June 27, 2025)

چیٹ بوٹس ذہن کو ختم کر رہے ہیں!

Noor Al-Sibai

ہم مختلف زمانوں میں مختلف رجحانات کے حامل رہے ہیں۔ کبھی کسی چیز کا غلغلہ بلند ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز کا۔ آج کل ایک چیز ایسی ہے جس کے بارے میں دن رات سُننے کو مل رہا ہے۔ جی ہاں، مصنوعی ذہانت۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے لیکن اِس کا بہت زیادہ اور بے جا استعمال اِسے زحمت میں بھی تبدیل کر رہا ہے۔

ویسے تو خیر ہر دور کے انسان نے ٹیکنالوجی کے ساتھ ہی زندگی گزاری ہے مگر اب معاملہ یہ ہے کہ ہزاروں برس کی ٹیکنالوجی اپنے اپنے درجۂ کمال کو پہنچنے کے بعد حتمی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ مصنوعی ذہانت مختلف زمانوں میں کی جانے والی محنتِ شاقہ کا نچوڑ ہے۔ یہ انسان کو بہت سے معاملات میں بے جا محنت سے محفوظ رکھنے میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔ ہاں، بعض معاملات میں کثرتِ استعمال کے باعث یہ انتہائی نوعیت کے نتائج پیدا کر رہی ہے۔ ماہرین اِس حوالے سے پریشان ہیں۔ وہ تحقیق کے ذریعے معلوم کر چکے ہیں کہ مصنوعی ذہانت پر بہت زیادہ انحصار پذیر رہنے کی صورت میں انسان کے لیے انتہائی نوعیت کے معاملات پیدا ہوتے ہیں۔ ذہن کی کارکردگی اِس سے بہت زیادہ متاثر ہو رہی ہے۔

محققین نے مصنوعی ذہانت کی معروف ترین ایپ چیٹ جی پی ٹی استعمال کرنے والوں کے اذہان کی اسکیننگ کے ذریعے معلوم کیا ہے کہ بعض معاملات شدید خرابی کی طرف جا رہے ہیں۔ اُن کا استدلال ہے کہ چیٹ جی پی ٹی کا بہت زیادہ استعمال انسان کو ذہن استعمال کرنے سے روک رہا ہے۔ اِس کے نتیجے میں ذہن کی بے عملی بڑھ رہی ہے۔ کسی بھی ذہن کے لیے سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اُسے باقاعدگی سے بروئے کار لایا جاتا رہے۔ چیٹ جی پی ٹی اور مصنوعی ذہانت کی دیگر ایپس اِس راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہیں۔

میساچوسیٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ماہرین نے چیٹ جی پی ٹی استعمال کرنے والوں کے ذہن کی اسکیننگ کے ذریعے پایا ہے کہ مصنوعی ذہانت کا غیر معمولی اور غیر ضروری استعمال انسان کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ اِس حوالے سے ماہرین پہلے ہی بارہا خبردار کر چکے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی مقبولیت اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس پر بہت زیادہ انحصار پذیر رہنے کی صورت میں ذہن کی کارکردگی شدید متاثر ہوتی ہے۔ ماہرین کئی سال سے خبردار کر رہے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کا زیادہ اور بے جا استعمال زبان دانی، طرزِ عمل اور فوری جواب دینے کی صلاحیت کے معاملے میں ذہن پر شدید نوعیت کا دباؤ ڈال رہا ہے۔

میساچوسیٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے ماہرین نے تحقیق کی روشنی میں جو مقالہ تحریر کیا ہے، وہ ابھی نظر ثانی اور نقد کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ انسٹیٹیوٹ کی میڈیا لیب نے چیٹ جی پی ٹی کے بہت زیادہ استعمال کے ذریعے کچھ لکھنے والوں کا موازنہ اُن لوگوں سے کیا ہے جو ایسا نہیں کرتے۔

محققین نے ۱۸ سے ۳۹ سال کے ۵۴؍افراد کو تین زمروں میں تقسیم کیا۔ پہلے زمرے میں وہ لوگ تھے جو لکھنے کے لیے چیٹ جی پی ٹی سے مدد لیتے تھے۔ دوسرا زُمرہ اُن لوگوں کا تھا جو اس سلسلے میں گوگل سے مدد لینے کے قائل تھے اور تیسرے زمرے میں وہ لوگ رکھے گئے جو اپنے طور پر لکھتے تھے یعنی مصنوعی ذہانت کی کوئی ایپ استعمال نہیں کرتے تھے۔ یہ تحقیق چار ماہ پر محیط تھی۔ ہر زمرے کے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ پہلے تین ماہ تک ہر ماہ ایک مضمون لکھیں اور چوتھے ماہ یا تو چیٹ جی پی ٹی کی مدد سے لکھیں یا پھر اُس کی مدد کے بغیر۔

چار ماہ مکمل ہونے کے بعد تحقیق کے تمام شرکا کے ذہن کی اسکیننگ کی گئی اور اِس سلسلے میں الیکٹرو اینفیلوگرام (ای ای جی) مشین کو بروئے کار لایا گیا۔ یہ مشین ذہن کی سرگرمیوں کو ریکارڈ کرتی ہے۔ اس مشین کے ذریعے جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ جو لوگ چیٹ جی پی ٹی زیادہ استعمال کرتے تھے، اُن کا ذہن سوچنے کے معاملے میں سُست تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زبان دانی اور طرزِ عمل کے معاملے میں بھی کمزور پڑ چکے تھے۔ ایک نمایاں خرابی یہ پیدا ہوئی کہ وہ سُست پڑ چکے تھے، اُن کے مزاج میں کاہلی یا بے عملی نمایاں تھی۔ جو لوگ گوگل کی مدد سے مضمون لکھتے رہے تھے، اُن کے ذہن کی کارکردگی بھی بہت اچھی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ قابلِ قبول حد تک فعال تھے۔ اِن دونوں کے مقابلے میں مصنوعی ذہانت کی کسی بھی ایپ سے مستفید نہ ہونے والوں کے ذہن کی سرگرمیاں بھرپور تھیں اور وہ پوری توانائی اور جذبے کے ساتھ اپنا کام مکمل کرنے میں کامیاب رہے تھے۔

چیٹ جی پی ٹی اور مصنوعی ذہانت کی دیگر ایپس سے بہت زیادہ مدد لینے والوں کے بارے میں یہ حقائق کسی بھی سطح پر چونکانے والے نہیں کیونکہ ماہرین کئی بار اِس نوعیت کی منفی تبدیلیوں یا سنگین اثرات کے بارے میں انتباہ کر چکے ہیں۔ ہاں، تشویش کی بات ضرور ہے کیونکہ انسان اپنے ذہن سے کام لینا بھولتا جا رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے ٹولز کی مدد سے لکھنے والے اب سوچنے کی زحمت سے چُھٹ چکے ہیں۔

اے آئی چیٹ بوٹس انسان کو ذہن کے استعمال سے دور کر رہے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں فکر و نظر کا تنوع بُری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ مصنوعی ذہانت کو کام پر لگا کر لوگوں نے ذہن کو فارغ کر دیا ہے۔ ذہن ہے مگر اُس سے کام لینے والوں کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ لوگ سوچنے کی زحمت اور مشقت گوارا کرنے کو تیار نہیں۔

میساچوسیٹس انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے پہلے بھی اپنی تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ جو لوگ مصنوعی ذہانت کا بہت زیادہ سہارا لیتے ہیں، اُنہیں سوچنے اور سمجھنے میں غیر معمولی الجھن کا سامنا رہتا ہے۔ ایسے لوگ بیشتر معاملات میں سہارے ڈھونڈنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ ابتدا ہی سے سوچ سمجھ کر لکھنے کے عادی رہے ہوں اُن کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ فی زمانہ چیٹ جی پی ٹی اور دیگر ایپس کے ذریعے لکھنے کا رجحان سا جاری ہے۔ اِس طور لکھنے والے اچھا سوچنے اور معقول طرزِ نگارش کے حامل نہیں ہو پاتے۔ جو لوگ مصنوعی ذہانت کی ایپس کا بہت زیادہ سہارا لیتے ہیں وہ اُن کے بغیر سوچنے اور لکھنے کی صلاحیت سے اس قدر محروم ہو جاتے ہیں کہ جب یہ ٹولز میسر نہ ہوں تو اُن سے کام ہی نہیں ہو پاتا۔

سالِ رواں کے اوائل میں کارنیگی میلن اور چیٹ جی پی ٹی بنانے والے ادارے اوپن اے آئی میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے والے ادارے مائیکروسوفٹ کارپوریشن نے ایک مشترکہ تحقیق کے ذریعے جانا کہ چیٹ بوٹس بہت زیادہ استعمال کرنے والوں میں سوچنے کی صلاحیت خطرناک حد تک کم ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے بیشتر فیصلے بھی ڈھنگ سے نہیں کر پاتے۔ معروف برطانوی اخبار دی گارجین نے بھی ایک تجزیے میں بتایا تھا کہ چیٹ جی پی ٹی استعمال کرنے والوں میں حماقت کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ معروف امریکی اخبار وال اسٹریٹ جرنل کے ایک رپورٹر کا تو

////// باقی صفحہ نمبر ۱۰ \\\\\\

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950